Phone : 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر 1963

تخریبی عناصر

و اذا قیل لھم لاتفسدوا فی الارض قالوا انما نحن مصلحون ۔ الا انھم ھم المفسدون ولکن لا یشعرون (۲:۱۱-۱۲)

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ملک میں انتشار پیدا کر کے نظامِ معاشرہ کو تباہ مت کرو، تو یہ نہایت ڈھٹائی سے کہتے ہیں کہ ہم معاشرہ کو بگاڑنے کب ہیں ؟ ہم تو اسے سنوارنے والے، مصلحین ہیں — یاد رکھو! یہی لوگ معاشرہ میں انتشار پھیلانے والے ہیں ۔

حیرت ہے کہ یہ لوگ اس کا بھی احساس نہیں کرتے کہ ان کے قول و فعل کا یہ تضاد ان کی اصل و حقیقت کو کسطرح بے نقاب کر دیتا ہے ۔ (مفہوم القرآن)

شائع کردہ :

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت ۷۵ پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

جلد ۱۶ — نمبر ۱۱

بدلِ اشتراک
ہند و پاکستان سے سالانہ ۸ روپے
غیر ممالک سے سالانہ ۱۶ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہند و پاکستان سے
۷۵ نئے پیسے

ٹیلیفون نمبر ۸۰۸۰۰
خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵/بی
گلبرگ۔ لاہور

نومبر سنہ ۱۹۶۳ء

فہرستِ مضامین

۱۔ لمعات ———— ۲

۲۔ مجلسِ اقبالؒ ———— ۱۱

۳۔ انقلابی آواز ———— ۱۷

۴۔ باب المراسلات ———— (کیا خدمتِ دین کا معاوضہ جائز ہے؟) ———— ۳۵

۵۔ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت (محترم علامہ حسن الشرباصی السیفوری) ———— ۴۱
(ترجمہ سید نصیر شاہ)

۶۔ نقد و نظر ———— ۵۷

۷۔ رابطہ باہمی ———— ۶۴

۸۔ بچوں کا صفحہ ———— ۶۸

۹۔ احتساب ———— ۷۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

پاکستان کا تحفظ

پاکستان کے خلاف، ہندوستان کے مشئومہ عزائم، یوں تو روزِ اوّل ہی سے ایک کھلا ہوا راز تھا، لیکن اب وہ اس طرح ابھر کر سامنے آ رہے ہیں کہ اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا کہ وہ اس خطۂ زمین کو ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر دیکھ ہی نہیں سکتا۔ اس کے ساتھ ہی مغربی طاقتیں، ہندوستان کے ان مذموم ارادوں کو کامیاب بنانے کے لئے جو کچھ بالواسطہ اور بلاواسطہ کر رہی ہیں، وہ بھی کوئی سربستہ راز نہیں۔ یہ ہے وہ مقام جس پر ہم اس وقت کھڑے ہیں۔

ہندوستان نے، مطالبۂ پاکستان کی جس قدر مخالفت کی تھی وہ ابھی کل کی بات ہے، اس لئے ہم سب کے سامنے ہے۔ اسے یاد دلانے، یا دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ اس کی وجہ بھی بالکل واضح اور بین تھی۔ جن قوموں کے سامنے مساواتِ انسانی کی بلند قدر نہیں ہوتی وہ دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم رکھ کر بیحد خوش ہوتی ہیں۔ ہندوؤں کے ہاں انسانی مساوات کا تصور ہی نہیں۔ ان کے برتر طبقہ نے، خود اپنے ہاں کے دوسرے طبقوں کو اپنا محکوم اور غلام بنانے اور بنائے رکھنے کے لئے دونوں (ذات پات) کا عقیدہ وضع کیا اور ان زنجیروں کو مستحکم رکھنے کے لئے اسے جزوِ مذہب بنا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ برہمن اور کشتری کی ملی بھگت سے، اپنی جیسے دوسرے انسان — ویش اور شودر — پیدائشی غلام بن کر رہ گئے۔ اور یہ سلسلہ ہزاروں سال تک مسلسل جاری رہا۔ بالادست طبقہ نے، زیردست طبقہ کے لوگوں میں اتنی سکت ہی نہیں چھوڑی تھی کہ وہ ان کے خلاف کوئی آواز اٹھا سکتے — آواز اٹھانا تو ایک طرف، وہ اس کے خلاف دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی خیال نہیں لا سکتے تھے، اس لئے کہ انہیں بتایا گیا تھا کہ یہ تقسیم و تفریق خود برہما (خدا) کی پیدا کردہ ہے اس لئے اس کے خلاف احساس تک پیدا ہونا، خدا کے خلاف بغاوت ہے۔ اس استبداد کے خلاف، بدھ مت کی

تحریک اٹھی تو انہوں نے اسے اس طرح کچلا کہ ان کا نام و نشان تک ہندوستان میں باقی نہ رہنے دیا۔ غور کیجئے۔ اشوکا جیسی عظیم سلطنت کا علمبردار مذہب، اور اسے ہندوستان کی چاردیواری سے باہر جاکر پناہ ڈھونڈھنی پڑی! یہ ہے ہندو کا انتقام!

اس دور میں، زمانے کے تقاضوں سے، ورنوں جیسے خلاف انسانیت عقیدہ اور تفریق کے خلاف خیالات کا ابھرنا فطری امر تھا۔ ہندوؤں کے سیاسی مدبروں نے اس حقیقت کو بھانپ لیا اور، چونکہ وہ جانتے تھے کہ اب اس مخالفت کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں ہوگا، اس لئے انہوں نے خود اپنے ہاتھوں ان بندھنوں کی گرہیں کھولنی شروع کر دیں۔ وہ ان گرہوں کو تو کھول رہے تھے لیکن ساتھ ہی یہ احساس بھی بیدار ہو رہا تھا کہ ویشوں اور شودروں کو اپنے حلقۂ غلامی سے آزاد کرنے کے بعد، حکومت کس پر کی جائے گی؟ اس جذبہ کی تسکین کا سامان کیا ہوگا؟ اس مشکل سوال کا حل بھی، برہمن کی نگہ دوررس نے جلدی پا لیا۔ اس نے سوچ لیا کہ انگریز کے ہندوستان سے چلے جانے کے بعد، ملک میں جمہوری حکومت قائم کی جائے۔ اس طرز حکومت میں، اقتدار کی باگ ڈور ہمیشہ اکثریت کے ہاتھ میں رہتی ہے، اور وہ اس طرح اقلیت پر مستقل حکومت کرتی رہتی ہے۔ ہندوستان میں اکثریت ہندو کی تھی، اور مسلمان اقلیت میں تھے۔ دونوں میں عددی فرق اتنا زیادہ تھا کہ مسلمان اقلیت کا اکثریت میں تبدیل ہو جانا، ناممکن تھا۔ یہ تصور ایسا خوش آیند اور سنہرے خوابوں کا حامل تھا کہ ہندو نے اس منصوبہ کو کامیاب کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔

لیکن عین اس وقت، مسلمانوں میں اقبالؒ اور جناحؒ پیدا ہو گئے جن کی عقابی نگاہوں نے اس خطرے کا پورا پورا جائزہ لے لیا اور یہ تہیہ کر لیا کہ جتنے مسلمانوں کو بھی ہو سکے اس آنے والی تباہی کے سیلاب سے بچا لیا جائے۔ انکے اس عزم کا نام تھا تحریک پاکستان۔ آپ سوچئے کہ اس تحریک کی کامیابی سے ہندو کا وہ سنہرا سپنا کس طرح خواب پریشاں بن رہا تھا! اس کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی اور اسی شدت کے ساتھ ہوئی جس شدت سے فرعون نے بنی اسرائیل کے مصر سے نکل جانے کی تحریک کی مخالفت کی تھی۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون سے کیا کہا تھا؟ صرف یہ کہ بنی اسرائیل کو ملک سے چلے جانے کی اجازت دیدے تاکہ یہ خدا کی سرزمین پر سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو سکیں۔ ظاہر ہے کہ اس مطالبہ میں قوم فرعون کا کوئی نقصان نہیں تھا۔ لیکن وہ سوچتے تھے کہ اگر بنی اسرائیل یہاں سے چلے گئے تو ہم حکومت کس پر کریں گے؟ یہ وجہ تھی کہ قوم فرعون کی طرف سے، حضرت موسیٰؑ کے مطالبہ کی اس قدر شدید مخالفت ہوئی۔ اور یہی وجہ تھی مطالبۂ پاکستان کے خلاف ہندو کے جذبۂ معاندت کی۔

لیکن جس طرح مصر میں ہوا، اسی طرح یہاں بھی، ہندو کی اس قدر شدید مخالفت کے باوجود پاکستان وجود میں آگیا۔ اس سے ہندو کے دل پر کیا گزری، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ مسلمانوں پر مستقل حکومت کرنے کا خواب، خواب پریشاں بن کر رہ گیا بلکہ ان کے پندار کو اتنی بڑی شکست ہوئی جس کے زخم کے وہ متحمل ہی نہیں

ہو سکتے تھے - اس کے ساتھ ہی ایک اور احساس بھی تھا جو انہیں بری طرح طلسم پیچ و تاب بنا رہا تھا- ہندو کو اسلام اور قرآن کے نام سے جس قدر چڑ ہو سکتی ہے، وہ ظاہر ہے - مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اسی دعوے پر تھی کہ مسلمان، ہندوؤں کی حکومت سے آزاد ہونا چاہتے ہیں - ان کا دعوے یہ بھی تھا کہ ہمیں ایک ایسا خطۂ زمین درکار ہے جس میں اسلام کی فرماں روائی ہو- جس میں قرآن کی حکومت ہو- ان کے اس دعوے سے ہندو کے دل کی کیا کیفیت ہو رہی تھی، اس کا اندازہ (اُس زمانے میں) ان کے سرکردہ لیڈروں کی باتوں سے ہو سکتا تھا- (مثلاً) ۱۹۴۱ء کا ذکر ہے کہ لدھیانہ میں اکھنڈ ہندوستان کانفرنس منعقد ہوئی جس کے صدر مسٹر منشی تھے- انہوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا-

> تمہیں کچھ معلوم ہے کہ پاکستان کیا ہے؟ نہیں معلوم تو سن لیجئے- نظریۂ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ گوشوں میں اپنے لئے ایسے مساکن بنالیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے- مختصر الفاظ میں یوں سمجھو کہ پاکستان مسلمانوں کا ایسا خطہ ہوگا جس میں اسلامی حکومت قائم ہو- اس کے برعکس تم جانتے ہو کہ اکھنڈ ہندوستان کے سامنے کیا مقصد ہے- اس کا مقصد وہ عظیم الشان کلچر ہے جسے ہندی کلچر کہا جاتا ہے- وہ کلچر جو زمانۂ قبل از تاریخ میں پیدا ہوا اور چھ ہزار سال کی مدت میں پھیلا بڑھتا، پھولتا، پھلتا، زمانہ کی سطح کو یوں روندتا ہوا آگے بڑھتا گیا جس طرح مادر گنگا طوفان کے وقت امنڈتی چلی جا رہی ہو-
>
> (ٹریبیون - ۳ نومبر ۱۹۴۱ء)

قائداعظم بار بار اعلان کرتے تھے کہ

> مسلم لیگ کا نصب العین یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں اس لئے انہیں کسی دوسری قومیت میں جذب کرنے یا ان کے نظریات یا ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش کی جائے گی اس کی سخت مخالفت کی جائے گی- ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ ہم اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر کے رہیں گے-
>
> (خطبہ صدارت مسلم لیگ سیشن ۱۹۴۱ء)

آپ کو معلوم ہے کہ اس کا ردِ عمل ہندوؤں کی طرف سے کیا تھا؟ اسے مہاتما گاندھی کے پرائیویٹ سکریٹری، مسٹر مہادیو ڈیسائی کے الفاظ میں سنئے - انہوں نے اخبار ہریجن کی ۲۵ نومبر ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں لکھا تھا-

> ایک جداگانہ قومیت کا تخیل اس خیال سے پیدا ہوتا ہے کہ ہمارا مذہب دوسرے مذاہب پر فوقیت رکھتا ہے-

یعنی ہندو، اس تصور سے بھی تلملا اٹھتا تھا کہ اسلام کو ہندومت پر فوقیت حاصل ہے۔ ان جذبات کا اظہار اور تو اور، خود مہاتما گاندھی ان الفاظ میں کیا کرتے تھے۔

میری روح اس بات کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت مختلف اور متضاد کلچر اور نظریۂ حیات کے حامل ہیں۔ کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مرادف ہے کیونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا ہے۔ (ہندوستان ٹائمز ۱۴)

اس سے بھی زیادہ کھلے الفاظ میں۔

میں ایک تنگ نظر ہندومت یا تنگ نظر اسلام کا تصور نہیں کر سکتا۔ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے اور ایک بہت بڑی قوم ہے جو مختلف تہذیبوں پر مشتمل ہے اور یہ تہذیبیں ایک دوسری میں جذب ہونی شروع ہو گئی ہیں۔ لیکن مسلم لیگ نے مسلمانوں کو یہ سبق پڑھانا شروع کر دیا ہے کہ یہ تہذیبیں ایک دوسرے میں جذب نہیں ہو سکتیں۔ (ہندوستان ٹائمز ۱۵)

اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ پاکستان کی تشکیل یا ہندوستان کی تقسیم کے تصور سے ہندو کے دل پر کیا گزرتی تھی۔ وہ "بھارت ماتا کی تقسیم" کے متعلق علانیہ کہا کرتے تھے کہ یہ ایسے ہی ہے، جیسے کوئی شخص، کسی ہندو کے سامنے "گئو ماتا کے ٹکڑے کر ڈالے"۔

ہم نے اس تفصیل میں جانے کی ضرورت اس لئے سمجھی ہے کہ یہ حقیقت از سر نو ہمارے سامنے آ جائے کہ پاکستان کی تشکیل سے ہندوؤں کے دل میں کس قدر آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اس پس منظر میں آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اس سولہ سال کے عرصہ میں ہندوستان کی حکومت نے پاکستان کے خلاف جو کچھ کیا ہے اس کا جذبۂ محرکہ کیا ہے اور اب جب وہ اپنی مخالفت کو (گویا) اعلان جنگ کی حد تک لے آئے ہیں تو اس سے ان کا مقصود کیا ہے؟ ان کا مقصود صرف ایک ملک حاصل کرنا نہیں بلکہ اسلام کے احیاء کے امکان کو ختم کر دینا ہے۔ ان تصریحات کی روشنی میں آپ سوچئے کہ اس خطۂ زمین کی حفاظت کے معنی کیا ہیں اور اگر یہ (خدانخواستہ) کسی خطرے میں پڑ گیا تو اس کے عواقب کیا ہوں گے؟

تحفظِ خویش کا جذبہ، حیوانی جبلت کا تقاضا ہے۔ کوئی ذی حیات، مرنا اور مٹنا نہیں چاہتا۔ وہ اپنی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اپنی حفاظت کے معنی اپنے گھر کی حفاظت ہوتی ہے۔ موجودہ سیاست کی رو سے، ایک قوم کا گھر اس کا وطن ہوتا ہے۔ اس لئے وطن کی حفاظت، اس میں رہنے والے ہر مکین کا فطری تقاضا اور جبلی فریضہ ہے۔ اس لحاظ سے دیکھئے تو سرزمین پاکستان کی حفاظت، یہاں کے رہنے والوں کے لئے طبعی فریضہ ہے۔ جو اس فریضہ کی سرانجام دہی میں غفلت برتتا یا خیانت کرتا ہے، وہ (یوں سمجھئے کہ) انسانی سطح تو

ایک طرف حیوانی سطح سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔

لیکن مسلمان کے لئے تو اس سے آگے (اور کہیں بڑھ کر) ایک اور تقاضا اور بلند تر یہ فریضہ بھی سامنے آتا ہے۔ یہ خطۂ زمین صرف ہمارا گھر نہیں بلکہ اسلام کو ایک زندہ حقیقت کے طور پر پیش کرنے کے لئے ایک تجربہ گاہ ہے۔ اگر (خدانخواستہ) یہ سرزمین محفوظ نہ رہی تو یہاں اسلام کے احیاء کے امکانات ختم ہو جائیں گے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو پاکستان کی حفاظت ہمارا دینی فریضہ قرار پاجاتا ہے۔ اور یہ فی الواقعہ دینی فریضہ ہے۔ یعنی جس طرح، اس مقصدِ عظیم کے لئے اسے حاصل کرنا، دینی فریضہ تھا اسی طرح، اسے، اس مقصد کے لئے محفوظ رکھنا ہمارا دینی فریضہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس مقصد کو ایک زندہ حقیقت بنانے کے سلسلہ میں ہم سے بڑی کوتاہیاں ہوئی ہیں لیکن اگر یہ خطہ زمین محفوظ اور سلامت رہے تو ان کوتاہیوں اور فروگزاشتوں کی تلافی ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس، اگر (خدانخواستہ) یہ خطۂ زمین ہی باقی نہ رہا تو یہ مقصد حاصل کیسے ہو سکے گا؟

یوں تو پاکستان میں تخریبی عناصر شروع ہی سے چلے آرہے ہیں لیکن بدقسمتی سے، اب جو ہندوستان کی طرف سے خطرات کی گھٹائیں اس تیزی سے امنڈی ہیں تو ایسے وقت میں جب یہاں انتخابات کی آمد آمد ہے۔ معلوم نہیں یہ چیز موجودہ دور کی سیاست کے خمیر میں داخل ہے یا اس سسٹم کی خرابی ہے، انتخابات میں سارا زور دوسروں کے خلاف نفرت پھیلانے میں صرف کر دیا جاتا ہے۔ ایک فرد، دوسرے فرد کے خلاف منافرت کے جذبات پھیلاتا ہے۔ ایک پارٹی دوسری پارٹی پر کیچڑ اچھالتی ہے۔ اور اس میں برسرِ اقتدار پارٹی سب سے زیادہ ہدفِ طعن و تشنیع بنتی ہے، اس لئے کہ انتخابات میں ہر پارٹی کا مقصد حکومت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ جب کسی معاشرے میں، مسلسل اور متواتر، نفرت اور حقارت کے جذبات عام کئے جائیں اور ایسا کرنے میں نہ حدود کا لحاظ رکھا جائے نہ قیود کی پابندی ضروری سمجھی جائے، تو اس کا نفسیاتی طور پر جو نتیجہ ہو سکتا ہے، وہ ظاہر ہے۔ ایسے معاشرے میں نہ بلند مقاصد کا احساس باقی رہتا ہے نہ ان کے حصول کے لئے کوئی تڑپ اور خلش سینوں میں موجود۔ آپ سوچئے کہ اگر معاشرہ میں اندرونی طور پر ایسی فضا پیدا ہو رہی ہو، اور باہر سے اس قسم کا مہیب خطرہ سر پر آجائے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ خطرات کے مقابلہ کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کے دل میں ان بلند مقاصد اور اقدار کا احترام زیادہ سے زیادہ جاگزیں کر دیا جائے جن کے خلاف وہ خطرات امنڈ کر آرہے ہیں تاکہ وہ ان خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کریں۔ جس قدر یہ مقاصد لوگوں کی نگاہوں میں قیمتی اور یہ اقدار مقدس ہوں گی، اسی نسبت سے وہ ان کی حفاظت کے لئے جانفروشانہ طور پر تیار ہوں گے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملک کی حفاظت کے لئے فوجی طاقت ناگزیر ہے لیکن اس کا دارومدار، فوجی طاقت سے کہیں زیادہ، ملک کی عام آبادی کے ذوقِ یقین اور قوتِ ایثار و عمل پر ہوتا ہے۔ اندریں حالات، ہمارے نزدیک اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ انتخابی رسہ کشی کو بالائے طاق رکھ کر، ہر پارٹی اور ہر گروہ، اپنی پوری قوت ان خیالات کے عام

کرنے میں صرف کر دے کہ

(۱) پاکستان کے خطۂ زمین کا محفوظ اور سلامت رہنا کس قدر ضروری ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ محفوظ نہ رہا تو ہمارا حشر کیا ہوگا۔

(۲) وہ مقاصد کس قدر بلند اور مقدس ہیں جن کے حاصل ہونے کا ذریعہ یہ سرزمین ہے۔ ان مقاصد کی حفاظت کے لئے ہر کوشش جہاد ہے۔

(۳) یہ وقت نہیں کہ ہم اس بحث میں پڑیں کہ ان مقاصد کے بروئے کار لانے کے لئے کس کی طرف سے کیا کیا کوتاہی ہوئی۔ جس سے جو کچھ بھی ہوا اسے سردست بھلا دیجئے اور اپنی ساری قوت ان آنے والے خطرات کے مقابلہ کے لئے وقف کر دیجئے۔

(۴) ان خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے حکومت سے ہر ممکن تعاون کیجئے اور کوئی ایسا قدم اٹھانا تو ایک طرف کوئی ایسی بات بھی زبان سے نہ نکالئے جو ملک کی سلامتی کو نقصان پہنچانے والی ہو۔ یہ سلامت رہا تو ہم بھی سلامت رہیں گے اور ہمارے مقاصد کے حصول کے امکانات روشن - اور اگر خدانخواستہ یہی خطرے میں پڑ گیا تو ——

ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

يٰلَيْتَنِىْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا

——— ——— ———

(۲)

تحریکِ پاکستان اور جماعتِ اسلامی

لمعات لکھے جا چکے تھے کہ جماعتِ اسلامی کی طرف سے اخبارات میں اشتہار شائع ہوا کہ ترجمان القرآن کی آئندہ اشاعت میں (جسے وہ اپنے اجتماع کے موقع پر شائع کرنا چاہتے ہیں) "جماعتِ اسلامی اور تحریکِ پاکستان" کے موضوع پر بھی لکھا جائے گا۔ چونکہ یہ موضوع ایسا ہے جس کے متعلق طلوعِ اسلام میں تشکیلِ پاکستان کے بعد ہی نہیں بلکہ تحریکِ پاکستان کے دوران میں بھی اکثر و بیشتر لکھا جاتا رہا ہے (کہ یہ جماعت کس طرح شروع ہی سے اس تحریک کی مخالف رہی ہے) اس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ ترجمان القرآن کا مذکورہ صدر پرچہ دیکھ لیا جائے۔ (اس مقصد کے پیشِ نظر ہم نے طلوعِ اسلام کی طباعت میں تاخیر بھی گوارا کر لی)۔

ترجمان القرآن کے اشارات میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جماعتِ اسلامی نے پاکستان کی مخالفت نہیں کی تھی۔ چونکہ وقت اور گنجائش دونوں کم تھیں اس لئے ہم حالیہ اشاعت میں ترجمان القرآن کے اشارات کا جواب

پورا جائزہ نہیں لے سکتے۔ اسے ہم دوسری فرصت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ سردست ہم ان پر صرف ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہیں۔

۲۔ ترجمان القرآن (بابت نومبر ۱۹۶۳ء) نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ ــــ

(۱) تحریک پاکستان درحقیقت تقسیم ملک کی تحریک نہیں تھی بلکہ احیائے اسلام کے لئے ایک کوشش تھی۔ ملک کی تقسیم اس مقصد کے حصول کا ذریعہ تھی۔

(۲) جماعت اسلامی شروع سے احیاء اسلام کے لئے کوشاں رہی ہے۔ اس نے بیشک تقسیم ملک کی جنگ میں حصہ نہیں لیا لیکن جب یہ پاکستان کے مقصد سے متفق رہی تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ یہ پاکستان کی مخالف تھی۔

(۳) مودودی صاحب نے ۱۹۳۸ء میں ایک تجویز پیش کی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان میں مختلف قوموں کے الگ الگ حدود اراضی مقرر کر دیئے جائیں۔ انہوں نے یہ بات مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان سے بھی بہت پہلے کہی تھی۔

۳۔ ترجمان القرآن کے زیر نظر اشارات میں بار بار اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ ۱۹۳۰ء سے لے کر جب علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور دیا، تشکیل پاکستان تک یہی کہا جاتا رہا کہ مطالبۂ پاکستان صرف سیاسی اور معاشی مطالبہ نہیں بلکہ "اس مطالبہ کا اصل محرک مسلمانوں کا یہ شعور اور احساس تھا کہ اسلام ایک مکمل دین اور ایک ضابطۂ حیات ہے۔ اس میں مذہبی زندگی اور اجتماعی زندگی کے درمیان کوئی حد فاصل نہیں قائم کی جا سکتی اس لئے بحیثیت مسلمان ان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اجتماعی زندگی کی کوئی ایسی شکل گوارا کرلیں جو اُن کے مذہبی احساسات کے بالکل مغائر ہو" اسی سلسلے میں ترجمان القرآن نے آگے چل کر لکھا ہے کہ "لیگ کی قراردادیں بھی اس امر کی پوری طرح تائید کرتی ہیں۔ ان کو دیکھنے سے یہ بات اچھی طرح منکشف ہوجاتی ہے کہ تحریک پاکستان کا اصل مقصد تقسیم ملک نہ تھا بلکہ اس کا حقیقی نصب العین اسلام کا احیاء تھا"۔

اس کے برعکس آپ یہ دیکھئے کہ تحریک پاکستان کے دوران میں مودودی صاحب اس تحریک کے متعلق کیا کہہ کر مسلمانوں کو اس سے برگشتہ اور متنفر کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے۔

> مسلم لیگ کے کسی ریزولیشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمح نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔
>
> (سیاسی کشمکش حصہ سوم ـ مطبوعہ ترجمان القرآن محرم ۱۳۶۰ھ صفحہ ۲۷)

ہم مودودی صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ جو کچھ آپ اُس وقت فرماتے تھے وہ صحیح تھا یا جو کچھ اب ترجمان القرآن میں لکھا گیا ہے وہ درست ہے۔

۴۔ ترجمان القرآن نے لکھا ہے کہ اسلام کا احیاء تحریک پاکستان کا بھی مقصد تھا اور جماعت اسلامی کا بھی۔ فرق ذرائع میں تھا۔ جماعت اسلامی نے اگر اپنے سامنے کوئی دوسرا ذریعہ رکھ لیا تھا تو اسے مطعون کیوں کیا جائے۔ جیسا کہ معلوم ہے، اُس زمانے میں ہندوستان میں ایک اور گروہ بھی تھا جس میں بڑے بڑے جید علماء مثل مولانا حسین احمد مدنی مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، مفتی کفایت اللہ مرحوم وغیرہ شامل تھے۔ انہیں نیشنلسٹ علماء کہا جاتا تھا۔ ان کا بھی یہی دعویٰ تھا کہ ہم ہندوستان میں اسلام کا احیاء چاہتے ہیں۔ لیکن اس کا ذریعہ وہ نہیں جسے مودودی صاحب یا مسلم لیگ اختیار کر رہی ہے اس کا صحیح ذریعہ وہ ہے جسے ہم پیش کرتے ہیں۔ مودودی صاحب نے اس گروہ کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ ان کا یہ موقف اسلام کی تباہی کے لئے ہے حالانکہ ان کے اور مودودی صاحب کے موقف میں فرق صرف ذریعے کا تھا۔

سوال یہ ہے کہ اگر ذریعے کے فرق سے مودودی صاحب انہیں اسلام کا دشمن قرار دیتے تھے تو اسی ذریعے کے فرق کی بنا پر اگر مودودی صاحب کو تحریک پاکستان اور اسلام کا دشمن قرار دیا جائے تو یہ چیز کس طرح غلط قرار پائے گی؟

۵۔ ترجمان القرآن کا دعویٰ ہے کہ مودودی صاحب نے بھی یہ تجویز پیش کی تھی کہ مسلمانوں کے لئے حدود اراضی الگ مقرر کر دیئے جائیں۔ ترجمان القرآن کی تحریر کے مطابق یہ مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان سے بھی پہلے کی بات ہے لیکن جب مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ کیا تو انہی مودودی صاحب نے اس مطالبے کی سخت مخالفت کی۔ اور یہاں تک لکھ دیا کہ

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستان ایک ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔" (ترجمان القرآن بابت مئی و جون ۱۹۴۱ء صفحہ ۱۱)

کیا اس کے صاف معنی یہی نہیں کہ وہی بات جب مودودی صاحب نے پیش کی تو وہ عین اسلامی بھی لیکن جب وہ قائداعظم کی طرف سے پیش کی گئی تو مودودی صاحب کی نگاہ میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس کی کوئی اہمیت نہ رہی اور انہوں نے اس کی شدید مخالفت شروع کر دی بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا "وہ مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی۔" (ایضاً صفحہ ۲۹)

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ دلائل جو جماعت اسلامی نے اپنے اس دعوے کی تائید میں پیش کئے ہیں کہ وہ تحریک پاکستان کی مخالف نہیں تھی۔ قارئین ان دلائل کی محکمیت کا خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔

۶۔ اس ساری کشمکش میں یہ بات بہرحال غنیمت ہے کہ ان حضرات کو بالآخر تنگ آکر یہ کہنا پڑا کہ

ہم اس بات کا کھلے بندوں اعتراف کرتے ہیں کہ تقسیم ملک کی جنگ سے ہم غیر متعلق رہے ہیں۔ اس کارکردگی کا سہرا ہم صرف مسلم لیگ کے سر باندھتے ہیں۔ اور اس میدان میں کسی حصے کا اپنے آپ کو دعویدار نہیں سمجھتے۔ (ترجمان القرآن نومبر ۱۹۴۲ء۔ صفحہ ۶۹)

لیکن اتنا سا اعتراف اب بھی دیانت سے دُور ہے۔ دیانت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اس حقیقت کا اعتراف کرتے کہ ہم تقسیم ملک کے مطالبہ کی شدت سے مخالفت کرتے رہے ہیں۔ شاید زمانے کے تقاضے انہیں کبھی اس اعتراف پر بھی مجبور کر دیں۔ اس لئے کہ خود انہی کے الفاظ میں۔

چند انسانوں کو کچھ وقت کے لئے تو بے وقوف بنایا جا سکتا ہے لیکن اللہ کی ساری مخلوق کو ہمیشہ کے لئے فریب میں مبتلا نہیں رکھا جا سکتا ...... ایک ایسی حقیقت جو دن کے اجالے سے زیادہ واضح اور سورج سے زیادہ روشن ہے اسے آخر افترا کے طوفان کب تک لوگوں کی نظروں سے مستور رکھنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں (سوالنامہ ۳۶)

باقی رہا یہ دعوے کہ تحریک پاکستان کا نصب العین بھی احیائے اسلام تھا اور جماعت اسلامی کا نصب العین بھی یہی تھا تو اگرچہ اس نصب العین کے لئے الفاظ ایک جیسے استعمال کئے گئے ہیں لیکن جماعت اسلامی کا "اسلام" کا تصور بالکل اپنا ہے۔ تحریک پاکستان کے حامیوں میں سے کسی نے (حتیٰ کہ علامہ اقبال تک نے بھی) کبھی یہ نہیں کہا کہ اسلام وہ ہے جسے وہ اسلام کہدیں۔ لیکن جماعت اسلامی کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام وہ ہے جسے "مزاج شناس رسول" اسلام کہدے، اور مزاج شناس رسول خود مودودی صاحب ہیں۔ (اس بات کا اعلان انہوں نے فسادات پنجاب کی تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے کیا تھا)۔ یہ ہے وہ اسلام جسے لے کر یہ جماعت اٹھی ہے۔ اس جماعت کے مقاصد کے متعلق مودودی صاحب نے ۱۹۳۷ء میں اعلان کیا تھا کہ

یہ پارٹی اسلام کے اصولوں پر ایک نئے اجتماعی نظام اور ایک نئی تہذیب کی تعمیر کا پروگرام لے کر اٹھے اور عامۂ خلائق کے سامنے اپنا پروگرام پیش کر کے <u>زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت فراہم کر لے اور بالآخر حکومت کی مشین پر قابض ہو جائے۔</u>

(ترجمان القرآن۔ دسمبر ۱۹۳۷ء)

جب یہ پارٹی اس طرح برسر اقتدار آ جائے گی تو جو لوگ اس کے پیش کردہ اسلام سے متفق نہیں ہوں گے ان کے متعلق مودودی صاحب نے پہلے یہ کہا تھا کہ <u>ان کی حیثیت ذمیوں کی ہوگی</u>۔ (اسلام کا نظریہ سیاسی) لیکن اب ان کا فیصلہ ہے کہ انہیں ایک سال کا نوٹس دینے کے بعد <u>قتل کر دیا جائے گا</u>۔ (رسالہ مرتد کی سزا)۔

یہ ہے وہ اسلام جس کا احیاء اس جماعت کا نصب العین ہے اور جس کے لئے یہ "حکومت کی مشین پر قابض ہونا چاہتی ہے"

مجلسِ اقبالؒ

مثنوی : ——— پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق

سابقہ قسط میں (جو طلوع اسلام کے گزشتہ ستمبر کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی) یہ بتایا گیا تھا کہ قرآنی فقر اور غیر قرآنی فقر میں فرق کیا ہے۔ زیرِ نظر قسط کو اسی موضوع کی ایک کڑی سمجھنا چاہیے۔ اس میں قرآنی فقر کے حامل کو

مردِ حر

سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور اس کی خصوصیات یہ بتائی گئی ہیں کہ۔

مردِ حر محکم ز وردِ لاتخف ——— ما بمیداں سر بجیب او سر بکف

مردِ آزاد یعنی بندۂ مومن کا دل خوف و ہراس سے خالی ہوتا ہے۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ جب حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ ساحرینِ دربارِ فرعون سے ہوا تو اگرچہ قوت و سطوت کا ہر سامان فریقِ مخالف کے پاس تھا۔ اور حضرت موسیٰؑ کے پاس اپنے دعوے حق و صداقت کی تائید میں صرف دلائل و براہین تھے۔ لیکن عین مقابلہ کے وقت ان سے کہا گیا کہ۔

لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَىٰ ——— (۲۰/۶۸)۔

مت خوف کھاؤ۔ تم ان پر غالب آکر رہو گے۔

ہم میں اور مردِ حر میں فرق یہ ہے کہ ہم مصائبِ زندگی میں سوچ بچار میں پڑے رہتے ہیں کہ ایسا ہو گیا تو کیا ہوگا اور وہ سر بکف دشمن کے مقابلہ کے لئے باہر نکل آتا ہے۔ اس کی جرأتیں بیباک اور حوصلے نہایت بلند ہوتے ہیں۔

مردِ حر از لا الٰہ روشن ضمیر ——— می نگردد بندۂ سلطان و میر

وہ اس لئے کسی سے نہیں ڈرتا کہ اس کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہوتی ہے کہ دنیا میں اقتدار و اختیار کا مالک صرف خدا ہے۔ اس کے سوا کسی اور کی محکومی نہیں اختیار کی جا سکتی۔ اطاعت صرف اس کے قوانین کی کی جا سکتی ہے۔ اور بس۔ اس لئے وہ نہ صاحبِ قوت بادشاہوں کے سامنے جھکتا ہے۔ نہ دولت کے مالک، سرمایہ داروں سے غم کھاتا

ہے ۔ وہ دنیا کی ہر بڑی آستاں سے سرفرازانہ گزر جاتا ہے۔

مردِ حُر چوں اشتراں بارے برد   مردِ حُر بارے برد خارے خورد

اس کی اس جرأت و بیباکی کا راز اس میں ہے کہ وہ خلقِ خدا کی خدمت کرتا ہے۔ ان کی ذمہ داریاں اپنے سر پر لیتا ہے یعنی درد مندوں اور محتاجوں کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ اور اس کے معاوضہ میں ان سے کچھ نہیں مانگتا۔ وہ اپنا گزارہ نہایت معمولی سامانِ زلیت سے کر لیتا ہے جس طرح اونٹ کہ اس قدر بوجھ اٹھاتا ہے لیکن اس کے بعد اپنا پیٹ جنگل کی خاردار جھاڑیوں سے بھر لیتا ہے مردِ حُر کا یہی قلندرانہ انداز زندگی ہے۔ جو اسے ہر حرکت سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

پھر اونٹ ہی کی طرح اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

پائے خود را آنچناں محکم نہد   نبضِ رہ از سوزِ او بر می جہد

وہ سفرِ زندگی میں نہایت استقلال اور استقامت سے جادہ پیما ہوتا ہے۔ اس کے قدم میں کسی مقام پر بھی لغزش نہیں آتی۔ وہ اپنا قدم جہاں رکھتا ہے جا کر رکھتا ہے۔ اس طرح جا کر کہ اس کی گرمی سے راستے کی نبض میں تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ جن راہوں سے گزر جاتا ہے ان میں بھی حرکت و حرارت دوڑنے لگ جاتی ہے۔

جانِ او پائندہ تر گردد ز موت   بانگِ تکبیرش بروں از حرف و صوت

وہ جب راہِ حق میں جان دے دیتا ہے تو اس سے اس کی زندگی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ اس سے صرف اس کا طبیعی جسم مرتا ہے۔ اس کی ذات حیاتِ جاوداں کی پیکر بن کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ وہ جب میدانِ جنگ میں نعرۂ تکبیر بلند کرتا ہے تو اس کا یہ نعرہ الفاظ اور آواز کا رہینِ منت نہیں ہوتا۔ یہ اس کے دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے۔ اور خاموشی ہی خاموشی سے ساری فضا کو متاثر کر جاتا ہے۔ اس کا عملِ خاموش اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ کائنات میں غلبہ و اقتدار کی مالک صرف خدا کی ذات ہے۔ اس سے بلند و برتر کوئی نہیں (اللہ اکبر)

ہر کہ سنگِ راہ را داند زجاج   گیرد آں درویش از سلطاں خراج

جس مردِ آزاد کی یہ کیفیت ہو کہ سفرِ حیات میں اس کے سامنے جو مشکلات آئیں وہ انہیں ہیچ جانے، ہر سنگِ راہ اس کے پاؤں کے نیچے، کانچ کی طرح چورہ چورہ ہو جائے۔ اس کی قوتوں کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ درویش ہوتے ہوئے، بادشاہوں سے خراج حاصل کرتا ہے۔ بڑی سے بڑی قوتوں کے مالک شاہنشاہ اس کے سامنے جھکتے ہیں۔

گرمیٔ طبع تو از صہبائے اوست   جوئے تو پروردۂ دریائے اوست

حضرت علامہؒ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تمہاری تاریخ میں جہاں کہیں حرکت و حرارت کے آثار نظر آتے ہیں، یہ انہی مردانِ حُر کے عملِ حیات بخش کا نتیجہ ہے جنہوں نے دنیا میں خدائی حکومت کو قائم کیا۔ یہ جو مسلم ممالک میں ابھی تک یہاں وہاں کچھ زندگی کی ندیاں دکھائی دیتی ہیں، ان سب کی پرورش انہی کے دریائے ایمان و عمل سے ہو رہی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کے مردانِ حُر، قدسیوں کی اس جماعت کے جملہ افراد تھے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہؐ کے رفقاء کہہ کر پکارا ہے (محمد رسول اللہ والذین معہٗ) لیکن اگر آپ بات سمجھنے کے لئے ان میں سے کسی ایک کا محسوس کردار سامنے رکھنا چاہیں تو حضرت عمرؓ کی سیرت کو سامنے لائیے، آپ کو اس میں اقبالؒ کے مردِ حُر کی ایک ایک خصوصیت جگمگاتی نظر آئے گی۔

پادشاہاں در قبا ہائے حریر زرد رو از سہم آں عریاں فقیر

اس مردِ آزاد کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے کرتے میں جیسیوں پیوند لگے ہوئے ہیں، لیکن اس کے دبدبہ کا یہ عالم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے شاہنشاہ اس کے تصور سے کانپتے رہتے ہیں۔

ہم رموزِ دیں مارا خبر او درونِ خانہ ما بیرونِ در

ہم رموزِ دین کو محض ذہنی طور پر حاصل کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس کی زندگی دین کے قالب میں ڈھلی ہوتی ہے اس لئے وہ ان حقائق کو اپنی آنکھوں کے سامنے بے نقاب دیکھ لیتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ گویا وہ گھر کے اندر ہوتا ہے اور ہم اس کا طواف باہر سے کر رہے ہوتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس عہدِ مبارک و مسعود میں، نہ کہیں فلسفیانہ موشگافیاں تھیں نہ منطقیانہ نکات آفرینیاں۔ وہاں دین کے مقاصد کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھ لینے کے بعد ان کے حصول کے لئے پیہم جد و جہد میں منہمک ہو جانا مقصودِ حیات تھا۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

ان کے ایمان کی شہادت، ان کے اعمال کے زندہ و پائندہ۔ محسوس و مشہود نتائج سے ملتی تھی۔

ما کلیسا دوست۔ ما مسجد فروش او ز دستِ مصطفیٰؐ پیمانہ نوش

ہماری کیفیت یہ ہے کہ حقیر سے مفادِ عاجلہ کے لئے دین فروشی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے لئے کبھی عیسائیوں سے یارانہ گانٹھا جاتا ہے۔ کبھی یہودیوں سے پیمانِ وفا باندھا جاتا ہے۔ کبھی کفار کی دہلیزوں پر سر جھکایا جاتا ہے۔ کبھی مشرکین کے سامنے کاسۂ گدائی پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن مردِ حُر اس پست سطح پر کبھی نہیں اترتا۔ وہ نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھتا ہے اور اس کے رنگ میں ایسا رنگا جاتا ہے کہ وہ غیروں کے سامنے کبھی سر نہیں جھکاتا۔

مے مغاں را بندہ۔ نے ساقر بدست ما تہی پیمانہ او دستِ الست

وہ کبھی خالی پیالہ ہاتھ میں لے کر عجمی شراب خانوں سے، غیر قرآنی تصورات و نظریات کی گدائی نہیں کرتا۔ وہ قرآنی حقائقِ زندگی سے مست ہوتا ہے اس لئے اسے کسی سے کچھ مستعار لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

چہرۂ گل از نمِ او احمر است از آتشِ ما دود او دودش تر است

اس کی زندگی کا مقصد، اپنی انفرادی نجات اور روحانی ترقی، نہیں ہوتا۔ وہ حسن کائنات میں اضافہ کرتا اور دوسرے

انسانوں کی زندگیاں سنوارتا ہے۔ وہ ایسا معاشرہ قائم کرتا ہے جس میں اس کی محنت، دوسروں کی پرورش اور نشوونما کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاں کا دھواں، ہمارے ہاں کی آگ سے زیادہ روشن ہوتا ہے۔

دارد اندر سینہ تکبیر امم — در جبین اوست تقدیر امم

وہ خود ہی زندہ نہیں ہوتا اس کے حرکت و عمل سے، قوموں کی قومیں، حیات نَو سے ہم آغوش ہو جاتی ہیں۔ اقوامِ عالم کی تقدیر اس کی پیشانی میں جھلکتی ہے۔ وہ زمانے کے دھارے کا رُخ موڑ دیتا ہے۔ وہ قوموں کی تقدیریں بدل دیتا ہے۔

قبلۂ ما گاہ کلیسا گاہ دیر — او نخواہد رزقِ خویش از دستِ غیر

ہم محض روٹی کی خاطر، کبھی دنیا کی ایک طاقت کو اپنا قبلۂ مقصود قرار دیتے ہیں، کبھی دوسری کو۔ کبھی انگریز کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں، کبھی ہندو کے، لیکن مردِ حُر ان میں سے کسی کے سامنے بھی جھولی نہیں پھیلاتا۔ وہ اپنا رزق آپ پیدا کرتا ہے۔ اس لئے وہ کسی کا محتاج نہیں ہوتا۔

ما ہمہ عبدِ فرنگ۔ او عبدِ ہُو — او نگنجد در جہانِ رنگ و بو

ہم سب انگریز کے غلام ہیں۔ لیکن مردِ حُر صرف ایک اللہ کا غلام ہوتا ہے۔ اس کے قلب کی وسعتوں کے سامنے، یہ ساری مادی کائنات ہیچ اور تنگ ہو جاتی ہے۔ وہ پہنائے عالم کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ خود اس کے اندر گم نہیں ہوتا۔

صبح و شامِ ما بہ فکرِ ساز و برگ — آخرِ ما چیست؟ تلخی‌ہائے مرگ

ہماری ساری زندگی محض اپنی طبیعی ضروریات کے حصول کی تگ و دو میں صرف ہو جاتی ہے۔ یہی ہماری زندگی کا مقصود و منتہیٰ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب مقصود و منتہیٰ محض طبیعی زندگی ہو تو اس کا انجام موت کی تلخی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟

در جہانِ بے ثبات او را ثبات — مرگ او را از مقاماتِ حیات

یہ مادی کائنات اور خود انسان کی طبیعی زندگی ہر آن بدلتی اور فنا ہوتی رہتی ہے۔ لیکن مردِ آزاد کی ذات ان تغیرات سے اثر پذیر نہیں ہوتی۔ وہ حیاتِ جاوید کی حامل بن جاتی ہے، جسے ہم موت کہتے ہیں۔ وہ اس کے لئے زندگی کے مختلف مراحل میں سے ایک مرحلہ ہوتا ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ

موت اک زندگی کا وقفہ ہے — یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

اس کی زندگی اسی طرح ارتقائی مراحل طے کرتی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

اہلِ دل از صحبتِ ما مضمحل — گل ز فیضِ صحبتش دارائے دل

ہماری یہ حالت ہے کہ اگر کوئی صاحبِ ذوقِ سلیم کچھ وقت کے لئے ہمارے پاس بیٹھ جائے تو افسردہ خاطر اٹھے۔ اور

مردِ حُر کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ محض آب و گل کا پیکر انسان، اس کی صحبت سے ایسا جاذب بن جاتے کہ ہر ایک کا دل اس کی طرف کھنچا چلا آئے۔

کارِ ما وابستۂ تخمین و ظن　　　　او ہمہ کردار و کم گوید سخن

ہم چونکہ یقین کی لذت سے عاری ہوتے ہیں۔ اس لئے ہمارا ہر پروگرام ظن و قیاس پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ باتیں کم کرتا ہے، کام زیادہ کرتا ہے۔ اس کی پوری زندگی عملِ مسلسل اور سعیٔ پیہم کی داستانِ حیات بخش ہوتی ہے۔

ما گدایاں کوچہ گرد و فاقہ مست　　　　فقرِ او از لا الٰہ تیغ بدست

ہم ساری عمر بھک منگوں کی طرح ذلیل و خوار رہتے ہیں۔ وہ کاسۂ گدائی کی جگہ شمشیر بدست باہر نکلتا ہے اور خدا کے علاوہ کسی اور کے سامنے نہیں جھکتا۔

ما پرِ کاہے اسیرِ گردِ باد　　　　ضربش از کوہِ گراں جوئے کشاد

ہماری کیفیت خس و خاشاک کی سی ہے جسے ہوا کا ہر تند و تیز جھونکا جدھر چاہے اٹھائے اڑائے پھرے اور اس کی قوتوں کا یہ عالم کہ اس کی ایک ضرب، پہاڑ سے جوئے شیر نکال کر لے آئے۔

ہزار چشمے ترے سنگِ راہ سے پھوٹیں　　　　خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

یہ ہے وہ مردِ حُر کہ

محرمِ او شو، ز ما بیگانہ شو　　　　خانہ ویراں باش و صاحب خانہ شو

تو ہمارے پاس بیٹھ کر کیا کرے گا۔ جا اور کسی ایسے مردِ حُر کی صحبت میں بیٹھ اور اس سے ان حقائق کو سیکھ جن سے زندگی پہاڑ کی طرح محکم ہو جاتی ہے۔ اس کی ہدایت کے مطابق ہر قسم کی قربانی کر دے۔ اور اس کے بعد دیکھ کہ تجھے دنیا میں کیا کچھ نہیں ملتا!

شکوہ کم کن از سپہرِ گرد گرد　　　　زندہ شو از صحبتِ آں زندہ مرد

اس وقت تمہاری یہ حالت کہ تم ہر وقت تقدیر کا رونا روتے رہتے ہو۔ ہر سانس میں فلکِ ناہنجار کے شکوے کرتے رہتے ہو یہ اس لئے کہ تم زندگی سے عاری ہو۔ تم اس مردِ حُر کے پاس بیٹھو تا کہ تم میں زندگی بیدار ہو جائے۔ اور پھر تم تقدیر کے شکوے کبھی نہ کرو۔ تمہاری تقدیر خود تمہارے ہاتھ میں ہے۔ بشرطیکہ تم زندہ انسان ہو۔ مٹی کے تودے نہیں ہو۔

مردِ حُر دریائے ژرف و بیکراں　　　　آب گیر از بحر و نے از نا وداں

مردِ حُر کے علم کی گہرائیاں اور وسعتیں، حدود فراموش ہوتی ہیں۔ علم حاصل کرنا ہے تو اس سے حاصل کر۔ یہ لوگ

جنہیں — "عالم" کہا جاتا ہے ان کا علم پرنالے کا پانی ہے۔ جو ہر قسم کی غلاظت اور کثافت اپنے ساتھ بہا کر لاتا ہے اس سے تم کیا حاصل کرو گے؟

سینۂ ایں مرد می جوشد چوں دیگ — پیشِ او کوہِ گراں یک تودہ ریگ

علم کے ساتھ اس میں زندگی کی حرارت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اس کا سینہ دیگ کی طرح جوش زن نظر آتا ہے اور اس کے عزم کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اس کے سامنے بڑے سے بڑا پہاڑ ریت کے ڈھیر سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔

روزِ صلح آں برگ و سازِ انجمن — ہم چو بادِ فرودیں اندر چمن !!
روزِ کیں آں محرمِ تقدیرِ خویش — گور بہر خود می کند از شمشیرِ خویش

وہ حلقۂ یاراں میں ہو تو بریشم کی طرح نرم ہوتا ہے۔ صلح کی گفتگو ہو رہی ہو تو بادِ بہاری کی طرح ہر سبزہ کا منہ چومتا اور ہر غنچہ کو پیغامِ شگفتگی دیتا ہے۔ اس کے برعکس جب وہ میدانِ جنگ میں ہو تو بے جگری سے لڑ کر اپنی جان دے دیتا ہے، گویا وہ اپنی تلوار سے آپ اپنی قبر کھودتا ہے۔ اس کی حالت یہ ہوتی ہے کہ

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

محمد رسول اللہ والذین معہ۔ اشداء علی الکفار — رحماء بینہم۔

اے سرت گردم گریز از ما چو تیر — دامنِ او گیر و بے تابانہ گیر

میں تیرے قربان جاؤں۔ ہمارے پاس نہ بیٹھ۔ ہم سے کنارہ کر۔ جا اور جا کر اس قسم کے مردِ حُر کا دامن تھام لے۔ اور والہانہ انداز سے اس سے وابستہ ہو جا۔

می نروید تخمِ دل از آب و گِل — بے نگاہے از خداوندانِ دل

دل کا بیج محض پانی اور مٹی کی آمیزش سے نہیں پھوٹا کرتا۔ اس کی روئیدگی کے لئے ایک اور چیز کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی ایک ایسے مردِ آزاد کی نگاہِ حیات بخش، جسے خدا کی عطا کردہ مستقل اقدارِ انسانیت سے عشق ہو۔

اندریں عالم نیرزی با خسے
تا نیاویزی بدامانِ کسے!

یاد رکھو۔ جب تک تو اس قسم کے مردانِ حُر کا رفیقِ کار نہ بنے اس وقت تک تیری قیمت پرِ کاہ جتنی بھی نہیں۔

دین کی زندگی انفرادی نہیں، اجتماعی ہے۔ اس کے لئے جماعت مومنین کے ساتھ ہونا نہایت ضروری ہے۔

اسی لئے قرآن کا ارشاد ہے۔ تصوف کی خلوت گزینوں کی زندگی، جس میں اجتماعی نظام کا تصور تک نہیں، غیروں سے مستعار لیا ہوا اندازِ زیست ہے۔ اور اقبالؒ کے الفاظ میں — اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا۔ مومن کی زندگی وہی ہے جس کا آئینہ صدیقِ اکبرؓ اور عمر فاروقؓ جیسے مردانِ حُر کا کردار ہے۔ اگر بآں نہ رسیدی تمام بولہبی است۔

انقلابی آواز

(بتقریبِ یومِ انقلاب)

اسے ملّتِ پاکستان کی بدقسمتی سمجھئے کہ قائداعظمؒ کے سانحۂ رحلت کے بعد ہی اس نوزائیدہ مملکت میں محلاتی سازشوں کے طوفان اٹھنے شروع ہو گئے۔ ہوسِ اقتدار کا جنون تند و تیز جولانیوں کی صورت اختیار کرتا چلا گیا۔ سیاسی اقتدار کے ایوان گٹھ جوڑ اور ناروا آویزشوں کے نشیمن بن گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قومی امنگوں اور عزائم کی نیّا اس گردابِ بلا میں ہچکولے کھانے لگی۔ اور وہ عظیم و جلیل مقاصد، جن کی بجا آوری کے لئے یہ سرزمینِ پاک حاصل کی گئی تھی ایک داستانِ پارینہ کی طرح ہم منزل بن کر رہ گئے۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں ذہنی درماندگی، شکست اور انتشار کا یہ طویل سلسلہ لئے اندیشہ ہائے دور و دراز کا آئینہ دار بن گیا کہ امید کی کوئی ایک آدھ شرمائی ہوئی کرن بھی ملت کے افقِ حیات پر جلوہ بار نہ رہی۔ اور پوری قوم مایوسیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں کھو گئی۔ قومی زندگی کا یہی وہ نازک مرحلہ تھا جب کہ ہماری مملکت کی سرحدوں کے محافظ اپنی زندگی کا ایک تلخ ترین فریضہ سرانجام دینے پر مجبور ہو گئے۔ اور غیرملکی جارحیت سے نپٹنے کے علاوہ ان کے لئے یہ ضروری اور لابدی ہو گیا کہ ملک کی داخلی صورتِ حال کی اصلاح کے لئے فیصلہ کن اقدام کریں۔ فوجی انقلاب کا محرک یہی جذبہ تھا۔ لیکن اس سے یہ اندیشہ بھی لاحق ہو سکتا تھا کہ پتہ نہیں میدانِ جنگ کے آزمودہ کار، عنانِ حکومت سنبھالنے کے بعد اس کا رخ کس سمت موڑ دیں۔ اور سفینۂ ملت ایک بھنور سے نجات پا کر کسی نئے تلاطم کی بلاخیز موجوں میں گرفتار ہو جائے۔

عسکری انقلاب آیا اور اس کے بعد قائدِ انقلاب محمد ایوب خان کے سرکاری اعلانات بھی منظرِ عام پہ آنے شروع ہو گئے۔ لیکن ابتدائی دور میں ان اعلانات کا تعلق عام طور پہ ملک میں جمہوریت کی بحالی کی یقین دہانیاں سے تھا۔ مملکت کے دستور و نظام کے خد و خال کیا ہوں گے؟ دینی تقاضوں کا مستقبل کیا ہو گا؟ تحریکِ پاکستان کے

مقاصد اعلیٰ کی عملی تشکیل کس انداز سے ہوگی؟ اس قسم کے بہت سے بنیادی سوالات کا جواب ابھی تک صدر مملکت کے ذمے باقی تھا اور یہ جواب سننے کے لئے ہم ہر لحظہ گوش برآواز تھے۔ آخر دو ماہ کے انتظار کے بعد ۱۲ دسمبر ۱۹۵۸ء کو گلستان فاطمہ میں ایک ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے صدر محمد ایوب خان نے پہلی بار ان سوالات سے متعلق اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کی اور کہا کہ

خطاب لاہور

اکتوبر کے انقلاب کا فلسفہ وہی تھا جو پاکستان کی تخلیق کا موجب بنا تھا۔ برسوں کی بدنظمی اور بددیانتی نے اس فلسفہ کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا اور اس تحریک کے اغراض و مقاصد کو داغدار اور زنگ آلود بنا دیا تھا جو تشکیل پاکستان پر منتج ہوئی تھی۔ اب حکومت کے سامنے سب سے اہم کام یہ ہے کہ ان مقاصد و مطامح کو اس دلدل سے نکال کر اس طرح صیقل کیا جائے کہ انہیں اپنی کھوئی ہوئی آب و تاب اور گم گشتہ عزت و عظمت پھر سے نصیب ہو جائے۔

(پاکستان ٹائمز ۔ ۱۲/۵۸ ۱۳)

یہ اعلان مختصر سا تھا لیکن جب یہ الفاظ پاکستان کی فضا میں گونجے تو اپنے اجمال و اختصار کے باوجود انہوں نے قوم کی دم توڑتی امنگوں اور افراد ملت کی ڈوبتی ہوئی نبضوں میں نئی زندگی کی ایک لہر سی دوڑا دی۔ اور ملت کا ہیجانی اضطراب اس خوش آئند اطمینان میں بدلتا دکھائی دیا کہ عسکری انقلاب کے قائد اس عظیم فریضہ سے بخوبی آگاہ ہیں جس کی بجاآوری مملکت کی نظریاتی اساس کا ناگزیر تقاضا پہلے دن سے چلا آرہا ہے۔

راولپنڈی میں

مارچ ۱۹۵۹ء میں راولپنڈی کے ایک خطاب میں صدر مملکت نے مملکت کے ان بنیادی تقاضوں سے پھر نقاب الٹا اور فرمایا۔

ہمارا سب سے مقدم فریضہ یہ ہے کہ ہم اس آئیڈیالوجی کا احیار و استحکام عمل میں لائیں جس کی رو سے پاکستان بحیثیت ایک آزاد مملکت کے وجود پذیر ہوا۔ پاکستان ایک خطۂ زمین کا نام نہیں جس میں آٹھ کروڑ نفوس بستے ہیں۔ پاکستان سے ہماری مراد ایک ایسی ملت ہے جو مخصوص اخلاقی روحانی اقدار کی امین ہے۔ یہ اقدار اسلام پر مبنی ہیں۔ ہمارے تجدد پسند حضرات کے نزدیک اسلام کا نام لینا فیشن کے خلاف اور قدامت پرستی کی دلیل ہے۔ یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان پر ترس کھایا جائے۔ اس کے برعکس یہ امر ہمارے لئے موجب صد ہزار فخر و مباہات ہونا چاہیئے کہ ہم ایسے مذہب کے پیرو ہیں جو ہمیں اس قسم کی بلند اقدار کی تعلیم دیتا ہے۔ مثلاً خدا ترسی، بنی نوع انسان سے محبت، ہمسایہ سے مروت، یتامیٰ کی نگہداشت اور غریبوں کی امداد۔ یہ اسلام کی وہ بنیادی اقدار ہیں جن کے بغیر تم اچھے انسان بن سکتے ہو، نہ اچھے پاکستانی۔

کمشنرز کانفرنس مری میں پھر انہوں نے (جولائی سنہ ۱۹۵۹ء میں) مری میں کمشنروں کی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

ہمارے سامنے اس وقت دو اہم مسائل ہیں۔ ایک یہ کہ ہم ایک مشترک اسلامی آئیڈیالوجی کے ماتحت لوگوں میں اتحاد پیدا کریں۔ اور اس آئیڈیالوجی کی تشریح و تبیین، عصر حاضر کی زبان میں زمانے کے موجودہ تقاضوں کے مطابق کی جائے۔ اس آئیڈیالوجی کی روح کو اسلام سے کشید کیا جائے۔ اور ہمارا زمانہ جس حد تک ترقی کر چکا ہے اس کی روشنی میں اس کی تعبیر کی جائے۔ اس وقت اشد ضرورت اس امر کی ہے کہ اہل فکر و نظر حضرات کو دعوتِ غور و تدبر دی جائے کہ وہ زندگی کے ان مسائل کا نہایت معقول حل دریافت کریں۔ دوسرا اہم کام یہ ہے کہ ملک کا معاشرتی اور معاشی ڈھانچہ ٹھوس اور مضبوط بنیادوں کا استوار کیا جائے۔ انسانی دل و دماغ کسی آئیڈیالوجی پر خواہ وہ کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو کبھی لبیک نہیں کہتا۔ جب تک اسے دو وقت پیٹ بھرنے کا یقین نہ ہو جائے اس سلسلہ اس امر کی بھی اشد ضرورت ہے کہ روٹی کے مسئلہ پر خاص توجہ دی جائے۔

(پاکستان ٹائمز - ۱۰ جولائی سنہ ۱۹۵۹ء)

دارالعلوم ٹنڈوالہ یار میں اس مرحلہ تک صدر مملکت کے یہ مختلف ارشادات کچھ اختصار کا پہلو لئے آ رہے تھے۔ انہوں نے بعض تقریبات میں جو کچھ فرمایا اس میں کچھ اجمال سا نمایاں تھا۔ پوری تفصیل نہیں تھی۔ ماہ مئی کے اوائل میں پہلی بار صدر مملکت محمد ایوب خان کو ٹنڈو الہ یار کے دارالعلوم میں علماء کے اجتماع کو خطاب کرنے کا موقع ملا۔ اور اس مذہبی اجتماع میں انہوں نے جو تقریر کی۔ وہ اپنی جامعیت کے اعتبار سے ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں انہوں نے پوری تفصیل سے اسلامی نظام سے متعلق اپنے نظریات و تصورات کو پیش کیا اور فرمایا ــــ

کوئی چودہ سو برس کا عرصہ ہوا کہ اسلام فضائے ہستی پر ابرِ رحمت بن کر نمودار ہوا۔ یہ (مذہب نہیں تھا بلکہ) ایک ترقی پسندانہ تحریک تھی جو اپنے زور دروں سے بڑھنے اور پھیلنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس نے حیاتِ انسانی کو نیا پیکر، اس کی جدوجہد کو نئی تعبیر اور کاروانِ انسانیت کو نئی منزل عطا کر دی۔

(پاکستان ٹائمز ۴- مئی سنہ ۱۹۵۹ء)

اس کے بعد انہوں نے کہا۔

جب تک یہ تحریک زندگی کا جزو بنی رہی اس کے متبعین دنیائے سائنس اور عملی علوم میں ایسے ایسے کارنامے دکھاتے رہے جن کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ بدقسمتی سے کچھ زمانہ گزرنے کے بعد،

مسلمانوں نے اسلام کو نظری مذہب میں تبدیل کرنے پر اپنی توجہات مرکوز کر دیں اور دین بحیثیت تحریک ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ زندگی اور مذہب میں ایک وسیع خلیج پیدا ہو گئی۔ یہ تفریق آج تک ہماری زندگی کو متاثر کئے جا رہی ہے۔ اسلام اس تفریق (یعنی مذہب اور زندگی کی ثنویت) کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔ لیکن یہ فطرت کی کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ خود اسلام کے متبعین اس ثنویت کا شکار ہو کر رہ گئے۔ (ایضاً)

انہوں نے مزید وضاحت فرمائی کہ

جب زندگی اور مذہب کا رشتہ منقطع ہو جائے تو زندگی تو بہرحال کسی نہ کسی سمت میں چلتی ہی رہتی ہے لیکن مذہب ایک ایسی بے جان شے بن کر رہ جاتا ہے جس میں نہ لوچ اور لچک باقی رہتی ہے نہ حرکت اور نمو کی صلاحیت۔ یہ جامد اور متحجر مذہب (زندگی کے دوش بدوش چلنے کے بجائے) مسجدوں اور خانقاہوں میں مقید ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسلام کے ساتھ یہی ہوا۔ انسانیت، سائنس اور فلسفہ میں ترقی کرتے کرتے کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہے۔ لیکن ہمارا مذہب صدیوں سے ایک ہی مقام پر ساکت و صامت کھڑا ہے۔ اسلام کا معجزہ یہ تھا کہ اس نے بت پرستی کا خاتمہ کر دیا۔ لیکن مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو بت بنا دیا۔ (ایضاً)

اس کا خطرناک انجام واضح کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا۔

مذہب کو یوں بت بنا دینے کا ایک خطرناک نتیجہ، جس نے ہماری ملی تہذیب اور ثقافت پر تباہ کن اثر ڈالا ہے یہ تھا کہ جن لوگوں نے عصر حاضر کی بڑھتی ہوئی ترقیوں کا ساتھ دیتے ہوئے آگے قدم اٹھایا ان پر دنیادار مسلمان کی مہر ثبت کر دی گئی۔ اور جو لوگ مذہبی رسومات و روایات کی آڑ لے کر ماضی کی دنیا میں جمود و سکون کے مجسمے بن کر رہ گئے وہ سچے اور پکے مسلمان کہلانے لگے۔ رفتہ رفتہ مستقبل کی طرف نگاہ رکھ کر شاہراہِ حیات پر آگے بڑھنے والے اسلام سے منحرف اور برگشتہ شمار ہونے لگے اور ماضی کی طرف دیکھنے والے مقدس دیندار قرار پا گئے۔ ہر نئی ایجاد ہر نئی تعلیم کے متعلق یہ شدید پراپیگنڈا کر دیا گیا کہ یہ اسلام کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری تاریخ کے ہر دور میں ہر انقلابی راہ نما کے خلاف کفر کے فتوے لگتے رہے۔ (ایضاً)

اپنے اس دعوے کی شہادت پیش کرتے ہوئے صدر مملکت نے علمائے کرام کو دعوتِ فکر دی کہ

میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ ذرا ان خطبات کا خالی الذہن ہو کر جائزہ لیں جو ہمارے ملک کی ہر مسجد میں پڑھے جاتے ہیں۔ ان میں آپ دیکھیں گے کہ موجودہ زمانہ کی چھوٹی سے چھوٹی بات پر

ناک بھوں چڑھائی جاتی ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ بات نئی ہے۔ میرے خیال میں یہ اسلام کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے کہ اس قسم کے بلند اور باعزت دین کو ترقی کا دشمن (اور علم و بصیرت کا حریف) بنا کر پیش کیا جائے۔ یہ صرف اسلام کے ساتھ ہی ظلم نہیں ہمارے ان نوجوانوں کے ساتھ بھی ظلم ہے جو آج کل کی ماڈرن دنیا میں مسلمان بن کر رہنا چاہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ چیز زندگی اور مذہب دونوں کے ساتھ انتہائی بے انصافی ہے کہ بیسویں صدی کے انسان پر یہ پابندی عائد کر دی جائے کہ اگر اسے اپنے آپ کو مسلمان ثابت کرنا ہے تو اسے کئی سو برس پیچھے جانا پڑے گا۔ (ایضاً)

اس کے بعد صدر مملکت نے کہا کہ غور طلب بات یہ ہے کہ اسلام جیسا ترقی پسند زندہ دین اس قسم کا جامد مذہب کیسے بن گیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے پہلے اس کی چند وجوہات استفہامیہ انداز میں خود ہی بیان کیں۔ انہوں نے کہا۔

(۱) کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے حقیقی نصب العین سے بھٹک گئے ہیں اور ایسا معاشرتی اور سیاسی نظام وضع کرنے میں ناکام رہے ہیں جو بدلتے ہوئے تقاضوں اور تغیر پذیر قدروں کے ساتھ چلنے کی سکت رکھتا ہو؟

(۲) یا ہم اپنے دین کو جنوں اور فرشتوں کی کہانیاں بنا کر اسے توہم پرستیوں کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے۔ اور اندھی تقلید کا نعرہ بلند کر کے انسان کی تخلیقی آرزوؤں کا راستہ روک دیا ہے۔

(۳) یا اس کی وجہ وہ تصوف ہے جس نے (زندگی کے حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی بجائے) ہم میں فرار کی ذہنیت پیدا کر دی ہے۔ اور زندگی کو قبروں اور حجروں میں محبوس کر دیا ہے؟

(۴) یا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے یہ غلط عقیدہ وضع کر رکھا ہے کہ ہم ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر اگلی دنیا میں نجات کے حقدار بن سکتے ہیں۔ کیا ہم اس حقیقت کو بھول چکے ہیں کہ آخرت کی زندگی ہماری اس زندگی کے اعمال کا ثمر ہے اور ہم جنت میں وہی کاٹیں گے۔ جو کچھ ہم دنیا میں بوئیں گے۔ (ایضاً)

ان سوالات کو پیش کرتے ہوئے انہوں نے علماء حضرات کو ایک اہم مشورہ دیا اور فرمایا کہ

یہ سوالات بہت اہم ہیں۔ ہمارے لئے ازبس ضروری ہے کہ ہم ان عناصر کی جڑ کاٹ لگائیں، جنہوں نے اسلام کی برق آسا، شعلہ صفت روح کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس تحقیق میں ہمارے سامنے بہت سی ایسی حقیقتیں آئیں گی جو نہایت تلخ اور ناخوشگوار ہوں گی۔ لیکن ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم تلخیوں اور ناخوشگواریوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے یقین محکم کے ساتھ بیباکانہ انداز میں سرگرم جستجو رہیں۔ (ایضاً)

اس کے بعد صدر محترم نے امت میں تفرقہ بازی کے رجحانات کی مذمت کی اور وحدت و اتحاد کی اپیل کرتے ہوئے کہا

عالم اسلام کے تشتت و انتشار کا ایک بڑا سبب مذہبی فرقہ بندی ہے۔ غلط یا صحیح، فرقے بہرحال موجود ہیں اور اس حقیقت سے صرف نظر کرنا حماقت ہے۔ اگر یہ بحث چھیڑ دی جائے کہ کون سا فرقہ حق پر ہے اور کون سا باطل پر تو اس کا نتیجہ تخریب کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے صحیح طریق یہ ہے کہ مختلف فرقوں کے اختلافی نکات کو ابھارنے کے بجائے ان امور پر زور دیا جائے جو ان میں مشترک ہیں۔ کیا یہ ٹھیک نہ ہوگا کہ ایک دوسرے کی نکتہ چینی کرنے کی بجائے ہم اس پر زور دیں کہ اصل و بنیاد کے اعتبار سے ہم سب ایک ہیں۔ اس لئے کہ ہم سب ایک خدا۔ ایک رسول اور ایک کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ (ایضاً)

ان اندرونی خرابیوں کے بعد صدر مملکت نے کمیونزم کے اس بیرونی خطرہ کا ذکر کیا جو اسلام کے لئے بڑا چیلنج ہے۔ انہوں نے کہا کہ

آج دنیا دو کیمپوں میں بٹی ہوئی ہے اور ان کی باہم کشمکش آئیڈیالوجی پر مبنی ہے۔ کمیونزم تہیہ کر چکی ہے کہ وہ اپنی آئیڈیالوجی تمام دنیا پر مسلط کر دے۔ مذہب کمیونزم کا کوئی موثر اور مکمل جواب نہیں پیش کر سکا۔ اس لئے کہ اس کی آئیڈیالوجی بنیادی طور پر مادہ پرستی پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جو اقدار مادیت سے نمودار ہوتی ہیں، نظام کائنات میں ان کا بھی ایک مقام ہے۔ لیکن وہ ایسی اہم نہیں کہ نوع انسانی ان کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دے۔ اندریں حالات کمیونزم کا ایک اور صرف ایک جواب ہے اور وہ جواب اسلام سے مل سکتا ہے۔ کمیونزم کا فلسفہ اور مغرب کی مادی اقدار کی کشمکش میں صرف اسلام ہی وہ فطری آئیڈیالوجی پیش کر سکتا ہے جو روح انسانیت کو ہلاکت سے بچا سکتی ہے۔" (ایضاً)

خطرہ کی روک تھام کے سلسلے میں انہوں نے فرمایا۔

کمیونزم کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسلام کو ماضی کے خلوت کدوں سے نکال کر عصر حاضر کی روشنی اور زبان میں پیش کیا جائے۔ اسے صرف ایک نظری آئیڈیالوجی کی حیثیت سے پیش نہ کیا جائے بلکہ ایک تمدنی، سیاسی، معاشی اور روحانی زندگی کے لئے مکمل ضابطۂ حیات کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ یہی اسلام کی صحیح اور بنیادی پوزیشن ہے۔ (ایضاً)

پاک جمہوریت کا دورہ دسمبر ۱۹۵۹ء کے دوسرے اور تیسرے ہفتہ میں صدر مملکت نے ملک کے مختلف گوشوں کا برق رفتاری سے دورہ کیا۔ اس دورہ میں مختلف مقامات پر اہم تقاریر ہوئیں اور پیغامات دیئے گئے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۱ دسمبر کو ملتان میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

مجھے یقین واثق ہے کہ ہمارے لئے جمہوریت نہایت ضروری ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پاکستان میں

کس انداز کی جمہوریت کی ضرورت ہے۔ کیا مغربی انداز کی جمہوریت (جو وہاں کامیابی سے چل رہی ہے) ہمارے لئے موزوں ہوگی؟ میرا خیال ہے کہ ہمارے تجربے نے یہ واضح کر دیا ہے کہ مغربی قالب کی جمہوریت ہمارے ہاں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ہمارے لئے ایسی جمہوریت کی ضرورت ہے جسے ہم سمجھ سکیں اور کامیابی سے چلا سکیں۔ (پاکستان ٹائمز ۱۸۔ دسمبر ۱۹۵۹ء)

دوسرے مقام پر انہوں نے فرمایا۔

جہاں تک اسلامی اصولوں کا تعلق ہے، پاکستان کا دستور یقیناً ان کا آئینہ دار ہوگا۔ لیکن (یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ) اسلام کے اصول غیر متبدل رہتے ہیں اور ان کی جزئیات، تفصیلات اور طریق حالات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ ان جزئیات کو ہمارے موجودہ حالات کے مطابق مرتب ہونا چاہیئے۔ (ایضاً)

گجرات میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا کہ

پاکستان ایک آئیڈیالوجی کی بنا پر وجود میں آیا ہے اور وہ آئیڈیالوجی اسلامک ہے۔ اس لئے اس میں شبہ کی گنجائش کہاں ہو سکتی ہے کہ پاکستان کا آئین اسلامی آئیڈیالوجی کا آئینہ دار ہوگا۔ آئین کمیشن ان حضرات پر مشتمل ہوگا جنہیں اسلام کی بھی پوری پوری واقفیت ہو اور جو علوم حاضرہ سے بھی باخبر ہوں۔ اس لئے کہ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے ملک کو تیرہ چودہ سو سال پیچھے دھکیل دیا جائے۔ اگر کمیشن کی سفارشات اس معیار پر پوری نہ اتریں تو کابینہ انہیں کبھی منظور نہیں کریگی۔ اور اگر بفرض محال کابینہ بھی انہیں منظور کر لے اور پارلیمان دیکھے کہ وہ اسلامی اصولوں کے مطابق نہیں ہیں تو وہ دو تہائی کی اکثریت سے ان میں تغیر و تبدل کر سکے گی۔ (پاکستان ٹائمز ۲۱ دسمبر ۵۹ء)

ملتان کی تقریر میں انہوں نے یہ بھی فرمایا تھا کہ

حکومت اس تجویز پر غور کر رہی ہے کہ دیہات کی مساجد کو پرائمری اسکولوں کے لئے استعمال کیا جائے۔ اور ائمہ مساجد کو ان اسکولوں میں ٹیچر مقرر کر دیا جائے۔ اس میں دشواری یہ ہے کہ تمام ائمہ مساجد پرائمری تک تعلیم دینے کے بھی اہل نہیں ہیں۔ بنیادی جمہوریتوں کا ایک فریضہ یہ بھی ہوگا کہ وہ ایسے امام مقرر کریں جو بچوں کو ابتدائی تعلیم دے سکیں۔

اس وقت تو اماموں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ نماز پڑھاتے ہیں اور پھر گھر گھر سے روٹیاں مانگتے پھرتے ہیں۔ ایسے ائمہ سے آپ یہ توقع کس طرح کر سکتے ہیں کہ وہ ملت کے تعمیری کاموں میں کوئی حصہ لے سکیں گے۔ (پاکستان ٹائمز ۱۸۔ دسمبر ۱۹۵۹ء)

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ

۱۳ر جولائی سنہ ۱۹۶۰ء کو ادارۂ تحقیقاتِ اسلامیہ (انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ) کراچی کے گورنروں کے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے آپ نے فرمایا۔

اس امر کی وضاحت نہایت ضروری ہے کہ اسلام کے بنیادی اصول کون سے ہیں۔ اور جن طریقوں سے ان اصولوں کو عمل میں لایا گیا تھا وہ کیا ہیں۔ یہ وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ اس باب میں کوئی الجھن باقی نہ رہے کہ اسلام میں کون سی باتیں غیر متبدل ہیں اور کون سی ایسی جن میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔ (پاکستان ٹائمز ۱۴ر جولائی سنہ ۱۹۶۰ء)

مسلکِ تقلید اور قدامت پرستی پر تنقید کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ لوگوں سے یہ کہہ دیا گیا کہ وہ کسی بات کا فیصلہ خود نہیں کر سکتے۔ ان سے کہا گیا کہ جو کچھ ان سے کہا جاتا ہے وہ اس پر آنکھیں بند کر کے چلتے جائیں (اور عقل و فکر سے بھی کام نہ لیں) لیکن اب لوگ اس طرح کی اندھی تقلید کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ اب حالات بدل چکے ہیں۔ (ایضاً)

اور اس کے بعد فرمایا۔

بیس تیس برس کے بعد کوئی شخص تمہاری آواز سننے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔ جب تک تم ایسی بات نہ کہو گے جو عقلِ عامہ کو اپیل کرے اور زمانے کے تقاضوں کو پورا کرے۔ (ایضاً)

یومِ انقلاب سنہ ۱۹۶۰ء

۲۶ر اکتوبر سنہ ۱۹۶۰ء کی شام، عسکری انقلاب کی دوسری سالگرہ کی تقریب پر انہوں نے ریڈیو پر جو پروگرام قوم کے نام نشر فرمایا اس میں اسلامی تصورِ حیات کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

علامہ اقبالؒ جن کا شمار عصرِ حاضر میں، روحِ اسلام کے بہترین روشن دماغ ترجمانوں میں ہوتا ہے کس قدر سچی بات کہی ہے۔ کہ اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلّی کی روحانی اساس ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر اور تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ ایک معاشرہ کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر و تبدل کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان نہیں۔ وہ تغیر جسے خود قرآن نے آیات اللہ میں شمار کیا ہے تو اس سے زندگی، جو حقیقتاً متحرک واقع ہوئی ہے،

یکسر جامد بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو سیاسی اور روحانی دوائر میں جو ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ ابدی اقدار پر ان کی گرفت نہیں رہی تھی اور گزشتہ کئی صدیوں میں اسلام کی قوت میں جو ضعف آیا ہے تو اس کی وجہ یہی جمود و تعطل تھا۔

اسلام کی تاریخ میں یہ پہلا وقت آیا ہے کہ وہ کروڑ مسلمانوں کو اس بات کا موقع ملا ہے کہ وہ اپنے ایمان اور زندگی کے روزمرہ کے مسائل میں امتزاج پیدا کرنے کے پروگرام میں شریک ہو سکیں۔

اسی نکتہ کی مزید نقاب کشائی کرتے ہوئے آگے چل کر فرمایا۔

قرآن کریم کی اہم تعلیمات سے ایک یہ بھی ہے کہ حیات ایک ترقی پذیر مسلسل عمل تخلیق ہے اس لئے ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل آپ تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں اپنے اسلاف (کے علمی سرمایہ) سے راہ نمائی لے لیکن اسلاف کے فیصلے ان کی راہ میں روک نہیں بن سکتے۔ (ایضاً)

اس کے بعد وہ قومی زندگی کے عظیم مقاصد کی طرف آئے اور کہا۔

ہمارے سامنے پہلا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے معاشرہ کو از سر نو منضبط کریں اور اسلامی آئیڈیالوجی کو اس کی بنیاد قرار دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ مقصد تھا جو تخلیق پاکستان کے لئے وجہ جواز قرار پایا تھا۔

اس مقصد کی طرف پہلا قدم اٹھانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے قلوب و اذہان کو وہ قسم کی نفسیاتی الجھنوں سے آزاد کرائیں۔ ان میں سے ایک الجھن جدید تعلیم کی پیداوار ہے۔ یہ تعلیم ہمارے دور غلامی میں رائج کی گئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے ہاں کی ہر شے جس میں دین بھی شامل ہے فیشن کے خلاف سمجھی جانے لگی۔

دوسری الجھن ان جامد عقائد کی پیداوار ہے جنہوں نے دین کی روح کو تعصب، توہم پرستی اور گلا گھونٹ دینے والے خیالات کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب سی دکھائی دے گی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہمارا یہ (نام نہاد) تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ طبقہ، دونوں ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اور وہ پلیٹ فارم ہے "دینی جہالت" (یعنی دین کے متعلق انہیں کچھ علم ہوتا ہے نہ انہیں)۔ (ایضاً)

ممالک اسلامیہ کا دورہ

نومبر ۱۹۶۰ء میں صدر محترم نے ممالک اسلامیہ کا دورہ فرمایا۔ اور حجاز اور مصر کے اہم مقامات پر ایسی پُرشکوہ اور حقیقت کشا تقاریر کیں جن کی صدائے بازگشت آج تک ان مقامات میں گونجتی ہے۔ انہوں نے ۹ نومبر کو سعودی عرب کے دارالحکومت ریاض میں ملٹری اکاڈمی کا معائنہ کرتے ہوئے وہاں کے افسروں اور سپاہیوں سے کہا۔

یہ اسلام کا پیغام تھا جس نے ماضی میں مسلمانوں کو اس قدر عظمت اور شوکت عطا کی تھی۔ اگر ہم پھر اسی عظمت کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے ـــــ اور وہ طریقہ ہے اسلام سے متمسک ہو جانے کا۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو مجھے اس میں قطعاً شبہ نہیں کہ (دنیا کی) امامت پھر ہمارے حصے میں آجائے گی۔ (ڈان ـــ ۳ نومبر ۱۹۶۲ء)

۴ نومبر کو انہوں نے جدہ میں تقریر کرتے ہوئے مسلم ممالک کو اسلام کی عالمگیر برادری کی تشکیل کی دعوت دی اور فرمایا۔

آج ساری دنیا سیاسی اور مادی آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر اپنے اپنے گروہوں کی تشکیل کر رہی ہے۔ ان تصورات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ تصورات انسان کی انتہائی منزل کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے۔ اس دنیا میں اور اُخروی زندگی میں (نوع انسان کی) نجات صرف اس آئیڈیالوجی کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہے جو انسان کے مادی اور روحانی تقاضوں میں صحیح صحیح توازن قائم کر سکے۔ ہم مسلمانوں کی خوش بختی ہے کہ ہمارے پاس وہ آئیڈیالوجی، دین اسلام کی شکل میں موجود ہے ـــ مسلم ممالک کے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ اپنے اپنے گھروں کی درستی کے بعد اسلام کی عالمگیر برادری کی تشکیل کریں اور اس میں باہمی رقابتوں کو دخیل نہ ہونے دیں۔

(ڈان ۵ نومبر ۱۹۶۲ء)

۶ نومبر کو قاہرہ کی ایک تقریر میں اسلامیانِ عالم کو اسلامی اخوت اور وحدت کی اہمیت یوں یاد دلائی۔

جب تک ہم اسلام کے بنیادی اصولوں سے متمسک رہیں گے، مادی، سیاسی یا مملکتی حدود کا کوئی خیال ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے جدا نہیں کر سکے گا۔ خدا سے میری دعا ہے کہ وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو وحدتِ مقصد اور یقین کی اس دولت سے مالا مال کرے۔ جس کا اسلام نے حکم دیا ہے اور جو آج کی دنیا میں، جس میں آئیڈیالوجی کی کشمکش ہو رہی ہے، ان کے نصب العین حیات کا تقاضا ہے۔ (ایضاً)

اسی تقریر میں آگے چل کر فرمایا۔

جو لوگ ایمان کے رشتے سے باہم دگر پیوست ہوں، وہ ان تمام قوتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں جو ان میں نزاع اور تشتت پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اور جب یہ ایمان اسلام کا عطا کردہ ایمان ہو، تو ان میں باہمی افتراق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اسلام، اختلافات کے مقابلہ میں اخوت، اشتعال انگیزی کے مقابلہ میں نرم روی اور مدارا، غلط فہمیوں کے مقابلہ میں باہمی افہام و تفہیم اور غصہ کے مقابلہ میں عفو اور درگذر کی روح ہے۔ (ایضاً)

۹ نومبر کو انہوں نے قاہرہ یونیورسٹی میں ایک معرکہ آرا تقریر کی جس کے دوران میں کہا۔

مسلمان کہیں بھی ہو، وہ اپنے اللہ سے اور خود اپنی ذات سے ایک عہد وفا استوار کرتا ہے۔ یہ عہد وفا دنیا کی ہر دوسری وفاشعاری کے عہد سے بلند ہے۔ یہ عہد وفا ہے ایمان کا۔ یہی وہ عہد وفا ہے جس کی وجہ سے دنیا کے تمام مسلمان، حکومتوں کے سیاسی اختلافات اور خارجی نزاعات کے علی الرغم، رشتۂ اخوت و مودت میں منسلک نظر آتے ہیں اور خیر سگالی اور خیر اندیشی کی غیر مرئی لہریں انہیں ایک دوسرے سے پیوست رکھتی ہیں۔ میری دعا ہے کہ باہمی مودت اور محبت کا یہ دبیز و عمیق چشمہ دن بدن وسیع سے وسیع تر اور عمیق سے عمیق تر ہوتا جائے اور خدا انہیں اس سے محفوظ رکھے کہ وہ اسے، ہنگامی فائدوں یا عارضی مصلحتوں کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیں۔

باہمی محبت اور اخوت کا نتیجہ یہ ہے کہ الجیریا کے مسلمانوں پر مظالم ہوں، یا فلسطینی پناہ گزینوں پر، کشمیری مسلمانوں کے جانکاہ مصائب ہوں یا اسرائیلی حکومت کی آئے دن کی دھمکیاں (یہ مقامی اثرات نہیں رکھتیں بلکہ) تمام دنیا کے مسلمانوں کے دل میں یکساں جذبات ہمدردی کو بیدار کر دیتی ہیں)۔

(ڈان ۔ ۱۰ نومبر ۱۹۶۰ء)

انہوں نے اپنی جدہ کی تقریر میں یہ بھی کہا تھا کہ

ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ اس کے سامنے کوئی اخلاقی اور روحانی آئیڈیالوجی ہو جس سے وہ اپنے مادی اور بلند اقدار کے تقاضوں میں توازن قائم کر سکے۔ ہمارے لئے یہ آئیڈیالوجی لازماً اسلام کی ہے۔ یہ امر موجب تاسف ہے کہ لوگ بالعموم اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ مذہب انسان (کے فائدے) کے لئے دیا گیا تھا۔ انسان کو مذہب (کے کسی فائدے) کے لئے نہیں بنایا گیا تھا۔ اس حقیقت کو فراموش کر دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ بجائے اس کے مذہب کی قوتوں کو انسان کی خدمت کے لئے استعمال کیا جائے، اسے زندگی کے حقائق سے یکسر الگ کر دیا گیا ہے۔

اس حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ دین کے اصول غیر متبدل ہوتے ہیں لیکن ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے طریقے، زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن (یہ بھی ضروری ہے کہ) یہ تبدیلی صحت مندانہ ہو۔

پاکستان اس بنیادی مسئلہ کے حل کے لئے امکان بھر کوشش کر رہا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے ہماری کوشش یہ ہے کہ ہم ایسا آئین مرتب کریں جو ہمارے ایمان (FAITH) سے ہم آہنگ ہو اور جو لوگوں کو اس قابل بنا دے کہ وہ پاکستان کی آئیڈیالوجی کو زندگی کے ہر شعبہ میں عملاً نفاذ پذیر کر سکیں۔ ہماری دوسری کوشش یہ ہے کہ ہم اپنے نظام تعلیم میں ایسی تبدیلی پیدا کریں جس میں

شروع ہی سے دینی اور دنیاوی تعلیم کا سلسلہ دوش بدوش چلے۔ (ڈان ۵ر نومبر ۱۹۶۰ء)

اسی تقریر میں انہوں نے آگے چل کر کہا۔

اس ضمن میں سب سے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم اپنے ذہن کو ماضی کے جمود اور تعطل سے آزاد کریں۔ دین کے ہر معاملہ میں دیانتدارانہ اور آزادانہ طور پر پوری پوری تحقیق کریں۔ اسلام پر اس انداز سے عمل کریں کہ وہ اس ایٹمی دور میں زمانے کی برق رفتاری کا ساتھ دے سکے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے ہم اپنے نظام تعلیم میں ایسی انقلابی تبدیلی کرنا چاہتے ہیں جس سے ہماری آنے والی نسلیں دینی اور دنیاوی تعلیم کے امتزاج سے نہایت اچھے انسان اور نہایت اچھے مسلمان بن سکیں۔ (ایضاً)

اور قاہرہ یونیورسٹی کی تقسیر میں فرمایا تھا۔

جوں جوں ہم دین کی روح سے دور ہٹتے گئے اور محض رسم پرستی کو دین سمجھ لیا، دین کی اصل حقیقت کی جگہ سطحیت نے لے لی۔ غور و فکر کی جگہ توہم پرستی آگئی اور جرأت تحقیق کی جگہ روایت پرستی کی اندھی تقلید نے سنبھال لی۔ مسلمانوں کو تاج و تخت اور حکومتوں اور سلطنتوں کے چھن جانے سے اس قدر نقصان نہیں ہوا جس قدر نقصان اس سے ہوا کہ ان سے اس دل کی حکومت چھن گئی۔ جس کا شعار آزادانہ تحقیق و کاوش تھا اور اس کی جگہ ان پر عقلی جمود مسلط ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی تو آگے بڑھتی گئی لیکن اسلام کا علم و عمل اس سے صدیوں پیچھے رہ گئے اور وہ دین جس کا مقصود یہ تھا کہ وہ ایک مکمل، متحرک اور حرکت بخش ضابطۂ حیات بنے، محض پوجا پاٹ کی ظواہر پرستی کا پیکر بن کر رہ گیا۔ نتیجہ یہ کہ اس دنیا میں، جو ہر آن آگے بڑھتی جا رہی ہے، مسلمان کی نگاہیں مڑ مڑ کر پیچھے کی طرف جاتی ہیں۔

ہمارے نظام تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہم اسلام کو توہم پرستی اور تقلید و جمود کے اس جالے سے نکالیں جو اس پر چاروں طرف سے تنا گیا ہے۔ اور عصر حاضر کے علم اور سائنٹفک تحقیقات کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اسے آگے بڑھاتے جائیں۔ (ڈان ۱۵ر نومبر ۱۹۶۰ء)

۷ر نومبر کو صدر پاکستان کے اعزاز میں (قاہرہ میں) نیشنل یونین دینی کا اجتماع ہوا۔ اس میں تقریر کرتے ہوئے آپ نے کہا۔

ایک اور مسئلہ بھی ایسا ہے جو میرے خیال میں آپ حضرات کے ذہن رسا کے بھی ایسا ہی قریب ہے جیسا ہم پاکستانیوں کے۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام ایک ترقی پسند اور متحرک دین ہے۔

یہ ایک ایسا دین ہے جو عقل و فکر اور غور و تدبر کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ جو ہمیں زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ چلنا سکھاتا ہے۔ لیکن آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اس دین کے ساتھ بیتی کیا ہے۔ ایک طرف اس دین کو دیکھئے اور دوسری طرف عالم اسلام پر نگاہ ڈالئے بات نکھر کر سامنے آجائے گی۔

آج ساری دنیا کے مسلمان سب سے زیادہ پیچھے اور سب سے کم تعلیم یافتہ ہیں۔ کیا یہ صورت حالات ایسی تشویش انگیز نہیں کہ ہم سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس پر غور کریں کہ اس قسم کے دین کے نام لیواؤں کی ایسی حالت کیوں ہوگئی ہے؟ ہم سے کہاں غلطی ہوئی ہے اور اس کے ازالہ کی کیا صورت ہے؟ میرا خیال ہے کہ یہ ہر اس مسلمان کا فریضہ ہے جسے دیدۂ بینا عطا ہوا ہے کہ وہ سوچے کہ ہمارے اس زوال کے اسباب کیا ہیں؟ اور جس نتیجہ پر وہ پہنچے، اسے بلا خوف اور بے دھڑک واضح الفاظ میں قوم کے سامنے پیش کر دے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ ہمارے مذہبی طبقہ اور مذہبی راہنماؤں نے مشکلات و مصائب کے ہجوم میں ہماری ملّی روایات کے حفظ و بقا کے لئے بڑی خدمات سرانجام دی ہیں۔ لیکن کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ وہ اس وقت کر رہے ہیں، وہ اس طریق کی طرف ہماری راہنمائی کر سکتا ہے۔ جس سے ہم زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کے قابل ہو سکیں؟ ممکن ہے آپ اس کے جواب میں کہہ دیں کہ (۱) ان کے لئے یہ بتانا کیا ضرور ہے اور (۲) ہم پر یہ بھی کب لازم ہے کہ ہم زمانے کے تقاضوں کے ساتھ چلیں۔ میرا جواب یہ ہے کہ قوانینِ فطرت اور خود قرآن کریم ہمیں واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ جو لوگ اپنے اندر تبدیلی نہیں پیدا کرتے اور زمانے کے ساتھ نہیں چلتے، آخر الامر تباہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر ہم زمانے کے ساتھ چلنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، اپنی کمزوریوں کا اعتراف اور انہیں دور کرنے کی کوشش نہیں کریں گے تو پھر ہم دوسروں کے غلام بن جائیں گے اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اس مرتبہ کی غلامی، سابقہ دور کی غلامی کے مقابلہ میں، بہت زیادہ دیرپا ہوگی۔

(ڈان - ۵ - نومبر ۶۳ء)

دین کی غرض و غایت اور اسلام کی آئیڈیالوجی کو اس طرح واشگاف کرنے کے بعد انہوں نے پاکستان کا ذکر کیا اور فرمایا کہ

پاکستانی اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ان کا ملک اسلامک آئیڈیالوجی کی تخلیق ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ ہماری ہستی کی سب سے مقدم وجہ جواز ہی یہی ہے اور اگر ہم اس آئیڈیالوجی کو بصدق دل قبول نہیں کرتے تو ہم کبھی سچے پاکستانی نہیں بن سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ ہم حتی الامکان عصر حاضر کی سائنٹفک تحقیقات کی روشنی میں، اسلام کا صحیح صحیح مطالعہ کریں۔ (ایضاً)

عید الاضحیٰ کی تقریب

اس سال، عید الاضحیٰ کی تقریب پر صدر محترم نے، ملک کے نام ایک تقریر نشر فرمائی جس میں انہوں نے فرمایا۔

عزیز ہم وطنو! عید مبارک! عید الاضحیٰ کا مبارک دن اس عظیم الشان قربانی کی یادگار ہے جو محض اللہ کی راہ میں اس کی خوشنودی کے لئے مکمل بے غرضی کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔

اگر مسلمانوں نے اس جذبہ کی صحیح روح پر عمل کیا ہوتا تو آج دنیا میں ان کی حالت کچھ اور ہوتی۔ لیکن قربانی کی رسم تو باقی رہ گئی اور اس کے پیچھے جو ابراہیمیؑ روح تھی وہ روایات میں کھو گئی۔ یہ حال صرف قربانی کی رسم ہی کا نہیں ہوا بلکہ اسلام کے بہت سے دوسرے بنیادی اصولوں کا بھی یہی حشر ہوا ہے۔ صدیوں سے ہم نے مذہب کو علمی زیادہ اور عملی کم بنا رکھا ہے۔ علم میں بھی ہم نے مذہب کی روح کو روایات میں جکڑ کر ماضی کا قیدی بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے اکثر لوگ کتابی اسلام سے تو ضرور کچھ نہ کچھ واقف ہیں لیکن مذہب کے اس پہلو سے بہت دور ہیں جو زندگی کا لازمی حصہ ہونا چاہیئے۔ (بحوالہ طلوع اسلام۔ جولائی ۱۹۶۱ء)

ماضی کی چار دیواری

بڑھتی ہوئی تعلیم اور ترقی کے اس زمانے میں زندگی کی رفتار بے حد تیز ہو گئی ہے اور انسان کا ذہن بہت سی ان حدود سے آزاد ہو گیا ہے جو بے علمی کی وجہ سے قائم تھیں۔ آج کا ذہن صرف اسی بات کو قبول کرے گا جو سائنس اور علم کے اس عجیب و غریب دور میں اسے مطمئن کر سکے۔ اگر ہم نے مذہب کو ماضی کی چار دیواری میں قید رکھا تو یہ خطرہ ہے کہ حال و مستقبل کے بہت سے لوگ لادینی کا شکار ہو جائیں گے۔

عزیز ہم وطنو! ہم لوگ اس بات پر فخر کرنے کے عادی ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں ہر زمانے اور ہر جائز ترقی کا ساتھ دینے کی صلاحیت موجود ہے لیکن یہ دعویٰ صرف بیان کر دینے سے ہی ثابت نہیں ہو سکتا، بلکہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کو عملی طور پر بھی ثابت کر کے دکھائیں۔ اس مقصد کیلئے دو باتیں بہت لازمی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم اسلام کے اصولوں کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور دوسرے یہ کہ اپنے زمانے اور ماحول کی روشنی میں ان پر عمل کرنے کی راہیں تلاش کریں۔ (ایضاً)

ابدی اصول کلام پاک کے اندر ہیں

جہاں تک اسلام کے اصولوں کا تعلق ہے اسے خود اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں وضاحت سے بیان فرما دیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگر چہ قرآن شریف تبرک کے طور پر پڑھا اور پڑھایا تو ضرور

جاتا ہے لیکن اس کو سمجھنے کی زیادہ کوشش نہیں کی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے عقائد اور عمل میں ایک بہت بڑی خلیج حائل ہو گئی ہے۔

اصول خواہ دینی ہوں یا دنیوی، اس لئے نہیں بنائے جاتے کہ ان کو بت بنا کر ان کی پرستش کی جائے۔ اصول تو صرف اس لئے بنتے ہیں کہ ان پر صحیح طور پر عمل کیا جائے۔ اصول اپنی جگہ بنیادی ہوتے ہیں۔ اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں آیا کرتی۔ لیکن اصولوں پر چلنے کے انداز ہر زمانے اور ہر ماحول کے مطابق ترقی کرتے رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو علم اور عمل الگ الگ راہوں پر چلنے لگتے ہیں اور ان میں کوئی رابطہ قائم نہیں رہ سکتا۔ مثال کے طور پر جب بجلی پیدا کرنے کا اصول ایجاد ہوا تو پہلے پہلے جو شخص ہاتھ لگاتا تھا صرف جھٹکے لگتے تھے۔ پھر جیسے جیسے انسان کا علم بڑھتا گیا ویسے ویسے بجلی کو استعمال کرنے کے نئے طریقے بھی دریافت ہوتے گئے۔ چنانچہ آج اس بجلی سے روشنی پیدا ہوتی ہے۔ پنکھے چلتے ہیں۔ وائرلیس اور ٹیلی ویژن کی لہریں پھیلتی ہیں اور بڑی طاقت والے ہوائی جہاز اڑتے ہیں۔ ان سب ترقیوں کے باوجود بجلی کی حقیقت اور اس کو بنانے کے بنیادی اصول قائم ہیں ان میں کسی قسم کا بھی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ (ایضاً)

مفتی صاحب کے خط کے جواب میں

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے صدر محترم کو عائلی قوانین کے سلسلے میں ایک خط لکھا تھا جس کے جواب کے اخیر میں صدر مملکت نے (جون ۱۹۶۱ء میں) لکھا تھا۔

اصولوں سے انحراف تو قطعی ناممکن ہے۔ لیکن ان پر عمل کے طریق کار کو تقاضائے وقت کے ساتھ ساتھ وضع کرنا صرف حکومت کا ہی نہیں بلکہ خود علمائے کرام کا بھی فرض ہے۔ اس بات کو میں "فرض" اس لئے کہتا ہوں کہ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم حال اور مستقبل کے دوریں زندگی کو لادینی کے خطرہ سے بچا سکتے ہیں۔

نئے طریق کار

ایک سیدھے سادے مسلمان کی حیثیت سے میرا خیال ہے کہ سنت، حدیث اور فقہ کی روشنی میں ہمیں عمل کے ایسے طریقہائے کار وضع کرنے پڑیں گے۔ جو آج کل کی دنیا میں قابل عمل اور موجودہ اذہان کے لئے قابل قبول ہوں۔ اگر ہم نے اس میں کوتاہی کی تو ہم خود زندگی اور مذہب کے درمیان ایک گہری خلیج حائل کرنے کے مجرم ہوں گے۔ یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی مروجہ روش سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ بات ان طبقوں پر بہت گراں گزرتی ہے جو اس کے عادی ہو چکے تھے۔ یا جن کے لئے وہ روش کسی قسم کے ذاتی یا جماعتی منفعت یا وقار کا باعث

تھی۔ لیکن یہی جذبۂ خدمت کا یہی تقاضا ہے کہ ایسی ذہنی یا نفسیاتی رکاوٹوں کو ترقی کی راہ کا روڑا نہ بننے دیا جائے۔ (بحوالہ طلوعِ اسلام جولائی ۱۹۶۱ء)

۲۵ ستمبر ۱۹۶۱ء کو کراچی میں بنیادی جمہوری اداروں کی خواتین کی طرف سے ایک سپاسنامہ کے جواب میں تقریر کرتے ہوئے صدرِ محترم نے فرمایا۔

قرآنِ کریم نے ہمیں جو بنیادی اصول دئے ہیں وہ ابدی ہیں۔ لیکن ان کی تشریح وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق ہونی چاہیئے۔ اور معاشرہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مقتضیات زمانہ کے مطابق ان پر عمل کرے۔ (یاد رکھیئے) صرف وہی قومیں زندہ رہ سکتی ہیں جن میں عقل و استدلال سے کام لینے کی بصیرت موجود ہے۔ (بحوالہ نوائے وقت۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۶۱ء)

یومِ انقلاب ۱۹۶۱ء انہوں نے ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۱ء کی شام وطن کے نام اپنے پیغام میں فرمایا۔ جیسا کہ میں نے ہمیشہ کہا ہے، ہمارے آئین کا بنیادی پتھر اسلام کی روح ہوگا۔

یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا اور اسی کی خاطر اسے حاصل کیا۔ ہماری بقا اور فلاح کا راز اسی اسلامی روح کے ساتھ دیانتداری سے تمسک میں ہے۔ ہمارے ملکی نظم و ضبط، بلکہ ہماری پوری زندگی میں اسلام ہی ہمارا پیش نہاد ہے اور میری کوشش یہ ہے کہ میں کم از کم ایک ایسی مشینری کی بنیاد رکھ دوں جو ہمارے ایمان کی روح کو کشید کر کے اسے ہماری عملی زندگی میں پھونک دے۔ جس سے ہمیں روشنی اور ہدایت اور فلاح و سعادت نصیب ہو۔

اس حقیقت کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ دین کے بنیادی اصولوں کے علاوہ، انسانی معاملات میں کوئی چیز ایسی نہیں جو ناقابلِ تغیر و تبدل ہو۔ (پاکستان ٹائمز ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۱ء)

صدرِ محترم کے اس سلسلۂ ارشادات کے بعد دو سال کا ایسا وقفہ بھی سامنے آتا ہے جس کے دوران اس اہم موضوع کے متعلق ان کی طرف سے بہت کم سنائی دیا۔ سطحی نگاہوں سے دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوا گویا وہ اسے بھول سے گئے ہیں۔ اور اب اس کی اہمیت محسوس نہیں کرتے۔ لیکن واقعات کا جائزہ لیجئے تو ایسا سمجھنا غلط فہمی پر مبنی ہوگا۔ اس دور میں بہت سے دیگر اہم مسائل ابھر کے صدرِ مملکت کے سامنے آ گئے۔ ان مسائل میں بھارت سے ہماری کشاکش، خارجہ پالیسی میں تبدیلی، چین سے دوستی، امریکہ کی طرف سے بے رخی اور اس نوعیت کے بہت سے دیگر معاملات شامل تھے۔ ان مسائل کا بڑا گہرا تعلق پاکستان کی بقا و تحفظ اور استحکام و استقلال سے تھا اور ان کی اہمیت اس قدر ہمہ گیر تھی کہ صدرِ مملکت کے لئے ان پر پوری توجہ مبذول کرنا اشد ضروری تھا۔ پاکستان میں اسلامی تصورات کی کارفرمائی کا عزم صمیم ان ایام میں بھی ان کے دل میں بدستور موجود تھا۔ چنانچہ جب انہیں گزشتہ ماہ اکتوبر کو

جامعہ اسلامیہ بہاولپور کی افتتاح کا موقع ملا تو یہ دبی ہوئی چنگاریاں ایک پھر حسب سابق اُبھر کر سامنے آئیں۔ اپنی افتتاحی تقریر میں انہوں نے فرمایا۔

ملک کے مستقبل کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے مذہبی ادارے صحیح خطوط پر منظم کئے جائیں پاکستان اسلام کی بنیاد پر قائم ہوا تھا ہم نے اپنے مذہب کے تحفظ کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں دولت پاکستان سے نوازا۔ شاید عالم اسلام میں پاکستان کے عوام کا مذہب سے زیادہ لگاؤ ہے۔ گزشتہ صدی میں ہمارے علماء کا خیال تھا کہ اسلام کے تحفظ کے لئے مسلمانوں کو انگریزی اور جدید سائنس کی تعلیم سے محروم رکھنا ضروری ہے۔ اسلام اللہ تعالیٰ کا سچا مذہب ہے۔ اس کے اصول سچے اور ہر زمانے کے لئے ہیں۔ اس لئے اسے جدید تعلیم یا نئے نظریات سے قطعاً کوئی خطرہ نہیں۔ خوف تو اس چیز کو ہونا چاہیئے جو جھوٹی اور بے بنیاد ہو۔ جو لوگ سچائی پر ہیں انہیں جدید سائنس یا نظریات سے قطعاً کوئی خوف نہیں ہونا چاہیئے۔ نئے نظریات اور جدید سائنس کا مقابلہ کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ ہم اپنے علم کی حدود کے اندر ہی رہیں۔ اور بیرونی اثر و نفوذ سے بالکل قطع تعلق کر لیں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم جدید علوم اور نظریات کا مطالعہ کریں۔ ہمارا مذہب ہمیں اسبات کی اجازت دیتا ہے کہ ہم جہاں بھی کوئی اچھائی یا خوبی دیکھیں اسے اپنا لیں۔ اور برائی کو رد کر دیں۔ قرآن اور سنت میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے جسے جدید علوم اور نظریات سے خطرہ لاحق ہو۔ اگر موجودہ وقت کے ہمارے علماء کوئی ایسا فتویٰ دیدیتے ہیں جو بدلے ہوئے حالات میں بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا تو ہمیں وہ راستہ اختیار کرنے سے کوئی ڈر نہیں ہونا چاہیئے جسے ہم صحیح سمجھتے ہوں۔ قرآن حکیم میں بار بار کہا گیا ہے کہ ہم اپنی عقل اور دانش سے کام لیں۔ علاوہ ازیں حضور اکرمؐ نے خود اجتہاد کے دروازے کھولے ہیں۔ اگر ہم نے تنگ نظری کا ثبوت دیا اور فرسودہ طریقے اپنائے رکھے۔ تو ہماری مستقبل کی نسلیں اسلام سے اسی طرح دور ہو جائیں گی۔ جس طرح مغربی اقوام اپنے مذہب سے دور ہو گئی ہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ یہ عمل شروع ہو چکا ہے۔ اس لئے ہمارے مذہبی رہنماؤں اور علماء کا اخلاقی، قومی اور مذہبی فرض ہے کہ وہ اسلام کے اصولوں کو دورِ جدید کی ضروریات پر منطبق کر کے ثابت کریں کہ یہ اصول سچے اور ہر زمانے کے لئے ہیں۔ فرسودہ نظریات سے جو بدلے ہوئے حالات میں کسی کام کے نہیں ہیں سختی سے وابستگی کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہماری آئندہ نسلیں مذہب سے دور ہو جائیں گی اور انہیں خوف خدا نہیں رہے گا۔ اسلام ایک ترقی پسند مذہب ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے جو عظیم کامیابی حاصل کی وہ اسلام کے اصولوں کی سختی سے پابندی کا نتیجہ تھی۔ انہوں نے زندگیوں کا آغاز غیر مہذب لوگوں میں کیا۔ لیکن وہ آرٹ، ادب اور سائنس کے ماہر اور دنیا کے

رہنما بن گئے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اسی اسلام کے پیروکار آج پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم صحابہ کرامؓ کے نقش قدم پر نہیں چل رہے۔ ہم نے اسلام کے اصولوں کو ترک کر دیا ہے۔ اور صرف اسلامی فقہ کو ہی اسلام سمجھتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک بار پھر عوام میں اسلام کی صحیح روح پیدا کی جائے۔

(کوہستان ۱۰ نومبر ۱۹۶۳ء)

ہم نے جو کچھ پیش کیا ہے یہ صدر مملکت محمد ایوب خان کے ان ارشادات اور نظریات و تصورات کا ایک تفصیلی سلسلہ ہے جو انہوں نے ہماری مملکت کی سب سے ممتاز اور ذمہ دار شخصیت کے منصب اعلیٰ سے گزشتہ ۵ سالوں میں مختلف اوقات پر قوم کے سامنے پیش کیا ہے۔ ہماری بصیرت کے مطابق ان ارشادات کا مفہوم قرآن کریم کے منشار و مقصود کے مطابق ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے ان کی تائید بھی کی ہے اور بار بار دہرایا بھی ہے۔ طلوع اسلام کا مسلک ہی یہ ہے کہ یہ ہر اس آواز کی تائید کرتا ہے جو قرآن کے مطابق ہو خواہ وہ آواز کسی گوشے سے اٹھے۔ اس آواز کا ملخص یہ ہے کہ دین کے قوانین اور اصول، قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ یہ اصول ہر اعتبار سے مکمل اور غیر متبدل ہیں اور تمام نوع انسان کے لئے ہمیشہ کے لئے ضابطۂ ہدایت۔ اسلامی مملکت، ان اصولوں کی روشنی میں، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، امت کے باہمی مشورے سے، فرعی قوانین مرتب کر کے معاشرہ کو ان کے مطابق چلاتی ہے۔

صدر محترم کی زبان پر بار بار ان الفاظ کا آنا اس حقیقت کی شہادت ہے کہ یہ ان کے دل کی آواز ہے۔ انہیں یقین محکم ہے کہ یہی اسلام کی صحیح تعبیر ہے اور اسی کے مطابق ہمارا معاشرہ متشکل ہونا چاہیئے۔ ہمارے نزدیک یہ امر بڑا ہی خوش آئند اور موجب صد اطمینان و مسرت ہے کہ ہماری مملکت کے سربراہ کے ایسے بلند خیالات ہیں۔ اس کے بعد ہم ان کی خدمت میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جب اسلام کے متعلق آپ کے یہ خیالات ہیں اور آپ سرفراز دیکھنے کے لئے آپ کے دل میں ایسی شدید تمنا ہے تو آپ معاشرہ کو ان خطوط پر متشکل کرنے کی ابتدا کر دیجئے۔ خدا کی تائید و نصرت آپ کے ساتھ ہوگی۔ اور ملت پاکستانیہ کے پُرخلوص طبقہ کا قلبی تعاون آپ کو حاصل ہوگا۔ اگر آپ نے ایسا کر دیا تو یقین ——— فرمایئے کہ آپ کا نام جریدۂ عالم پر سورج کی کرنوں سے لکھا جائے گا۔ تاریخ انسانیت آپ کو زمرۂ اقوام عالم میں بلند ترین مقام عطا کرے گی۔ اور خدا اور اس کی کائناتی قوتیں آپ پر سلام بھیجیں گی۔ یہ بہت بڑی سعادت ہے جس کے حصے میں آجائے۔

یہ ایک ایسا انقلاب ہوگا جس پر انسانیت فخر کرے گی۔

خریدار توجہ فرمائیں ادارہ سے ہر قسم کی خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے ورنہ عدم تعمیل کی شکایت نہ کیجئے (ادارہ)

بابُ المراسلات

کیا خدمتِ دین کا معاوضہ لینا جائز ہے؟

سرگودھا سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ فروری ۱۹۶۲ء کے طلوعِ اسلام میں، سید نصیر شاہ صاحب کا مضمون (عنوان بالا پر) شائع ہوا تھا اور اس کے اخیر میں ادارۂ طلوعِ اسلام نے علماءِ احناف کو اپنا نقطۂ نگاہ پیش کرنے کی دعوت دی تھی۔ لیکن اس دعوت کو قبول فرما کر آج تک کسی نے اس موضوع پر قلم اٹھانا گوارا نہیں کیا۔ طلوعِ اسلام نے بھی تا حال قرآنی فکر کی روشنی میں اس کی وضاحت نہیں کی۔ سوال بڑا اہم ہے۔ براہِ نوازش بالتفصیل اس بات کی تصریح فرمائی جائے کہ دین کی تبلیغ و تعلیم کے معاوضہ کی طلبگاری کس حد تک جائز ہے۔ آج کل کے علماء کا ذریعۂ معاش ہی یہی ہے۔

طلوعِ اسلام

طلوعِ اسلام نے مذکورہ صدر مضمون کے آخر میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس میں جو بحث اٹھائی گئی ہے وہ بڑی غور طلب ہے۔ اس لئے کہ یہ سوال بڑا اہم ہے کہ دین کی تبلیغ اور تعلیم کا صحیح نظام کیا ہے اور جو لوگ ان امور کی سرانجام دہی کے لئے مامور کئے جائیں، ان کے معاش کی صورت کیا ہونی چاہیئے — اس وقت بھی جب اسلامی نظامِ مملکت موجود نہ ہو۔ اور اس نظام کے تابع بھی۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس سوال کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ اسلامی نظام میں اس کی کیا شکل ہوگی اور دوسرا یہ کہ جب وہ نظام قائم نہ ہو اس وقت کیا صورت ہوگی۔

جہاں تک اسلامی نظام کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ اس میں دین — سیاست الگ ہوتا ہی نہیں۔ اس میں یہ شکل ہوتی ہی نہیں کہ اذان دینے، نماز پڑھانے، وعظ کہنے اور فتوے دینے کے لئے کوئی الگ جماعت ہو۔ مذہبی پیشوائیت کا

یہ تصور اس زمانے کا پیدا کردہ ہے جب دین اور سیاست میں افتراق ہوگیا۔ دین، مذہب میں تبدیل ہوگیا اور یہاں ہمارے ہاں بھی، دیگر اہلِ مذاہب کی طرح مذہبی پیشواؤں کا الگ گروہ پیدا ہوگیا۔ دین کے نظام میں وہ تمام امور جنہیں مذہبی پیشوائیت نے اپنی تحویل میں لیا تھا، دین کے اجزاء نہ تھے بلکہ امورِ مملکت تھے اور مملکت ہی انہیں سرانجام دیا کرتی تھی۔ اس مقصد کیلئے جو عمال مقرر کئے جاتے تھے ان کے معاش کی ذمہ داری بھی مملکت کے سر ہوتی تھی۔ چنانچہ اس باب میں سربراہِ مملکت سے لے کر نیچے تک، ہر ایک کی کفالت مملکت کی طرف سے ہوتی تھی۔ اس سلسلہ میں اور تو اور خود نبی اکرمؐ کے معاش کی کفیل بھی مملکت ہی تھی۔ یہی صورت، خلفائے راشدینؓ کی تھی۔ ان کا سارا وقت اُمورِ مملکت (یعنی خدمتِ دین) میں صرف ہو جاتا تھا۔ اس لئے ان کی ضروریات مملکت کی طرف سے پوری ہوتی تھیں۔ قرآن کریم میں جو آیا ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ (مع نبی اکرمؐ) اپنی قوم سے کہا کرتے تھے کہ لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ۔ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا تو اس کے مخاطب وہ غیر مسلم ہوتے تھے جن تک یہ حضرات اپنی دعوت پہنچاتے تھے تاکہ وہ لوگ جو ان کی دعوت قبول کرکے ان کے نظام میں شامل ہو جاتے تھے۔ اور اگر اس سے مراد اپنے لوگ بھی لے لئے جائیں تو اس اعلان کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اُن سے انفرادی طور پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتے تھے۔ ان کا معاوضہ اجتماعی نظام کے ذمے ہوتا تھا۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ ۔ (میرا اجر اللہ کے ذمہ ہے) کے یہی معنی تھے کہ میں ان امور کو فریضۂ خداوندی سمجھ کر سرانجام دیتا ہوں اور اس کا معاوضہ نظامِ خداوندی کے ذمہ ہے۔ انفرادی طور پر کسی کے ذمہ نہیں۔ سربراہِ مملکت سے نیچے اتیئے تو یہی صورت عمالِ حکومت کی تھی۔ چنانچہ قرآن کریم نے محصلینِ زکوٰۃ (حکومت کی آمدنی وصول کرنے والوں) کی کفالت کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔ اذان۔ امامت۔ خطابت۔ تعلیم۔ سب عمالِ مملکت کے فرائض تھے۔ باقی رہی دین کی تبلیغ، سو وہ عمالِ حکومت کے علاوہ انفرادی طور پر بھی ہر مومن کا فریضہ تھی۔ لہٰذا ان کے لئے اس کے معاوضہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اب رہا وہ دور جس میں اسلامی نظام قائم نہ ہو (جیسا کہ اس وقت ہے) تو اس سلسلہ میں موجودہ صورتِ حالات نہ صرف بڑی نا اطمینان بخش ہے بلکہ تباہ کن بھی ہے۔ اب اذان۔ امامت۔ خطابت۔ وعظ نصیحت وغیرہ سب کا شمار خدمتِ دین کے زمرے میں کر لیا گیا ہے، اور اس خدمت کو وہ لوگ سنبھال لیتے ہیں جن کا ذریعہ معاش کوئی اور نہیں ہوتا۔ اس کے لئے بھی ایسی شکل نہیں کہ اس منصب کے لئے جس قدر ضرورت ہو اسی کے مطابق لوگ پیدا ہوں۔ (جیسا کہ ملک کے دوسرے شعبوں میں ہوتا ہے)۔ اس کے لئے ہر سال ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ایسے لوگ نکلتے چلے آ رہے ہیں، اور چونکہ ان کے لئے خالی اسامیاں موجود نہیں ہوتیں اس لئے وہ اپنی جگہ آپ پیدا کر لیتے ہیں۔ اور اس کا معاوضہ قوم سے وصول کرتے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ کتنی مساجد ہیں جنہیں امام مسجد اپنی جگہ پیدا کر لینے کے لئے بنوا ڈالتے ہیں اسی طرح واعظ جگہ جگہ وعظ کہتے پھرتے ہیں قوم سے روپیہ بھی وصول کرتے ہیں اور احسان

بھی دھرتے ہیں کہ وہ دین کی خدمت سرانجام دیتے ہیں ــــ یہ خدمت اس کے سوا اور کیا ہوتی ہے کہ اُمّت میں باہمی نفرت اور عداوت کے جذبات کو مشتعل کیا جاتا ہے۔ اور بھائی کو بھائی سے الگ کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ یہی حرج وہ طالب علم جو مذہبی دارالعلوموں سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں، تلاشِ معاش میں سرگرداں پھرتے ہیں اور جب انہیں کہیں اور جگہ نہیں ملتی تو ایک مدرسہ قائم کرنے کی تدبیر کر لیتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ اس طرح ملک میں ایسے لوگوں کی تعداد کس قدر بڑھتی جا رہی ہے جو خود کچھ کمانے کے قابل نہیں اور دوسروں کی کمائی پر بوجھ بنتے ہیں۔ ایسے ملک کی معاشی حالت کبھی سدھر ہی نہیں سکتی۔

اس وقت ہمارے ہاں مساجد سے صرف اتنا کام لیا جاتا ہے کہ دن میں پانچ مرتبہ نماز پڑھ لی جائے اور جمعہ کے دن خطبہ سنا دیا جائے۔ پہلے تو یہ دیکھئے کہ اتنے سے کام کے لئے لاکھوں روپے کی عمارت باقی تمام وقت کے لئے بیکار پڑی رہتی ہے۔ پھر اس کام کے لئے کم از کم ایک مؤذن اور ایک امام ــــ اور بعض مساجد میں خطیب ــــ مستقل طور پر رکھے جاتے ہیں جن کا فارغ وقت کاٹے نہیں کٹتا ــــ انسان بالآخر کتنا وقت سو کر گزار سکتا ہے؟ مؤذن کے لئے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک شخص کو اوقاتِ مقررہ پر اذان دینی ہوتی ہے۔ اس لئے موجودہ حالات میں اس مقصد کے لئے کسی ایک آدمی کا تعین ضروری ہے۔ لیکن امامت کے لئے تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ایک شخص جس نے بالآخر خود بھی نماز پڑھنی ہے، اس لئے تنخواہ دار رہے کہ وہ باقیوں سے ذرا آگے کھڑا ہو کر نماز پڑھتا ہے جیسے بھی امامت کے لئے مسئلہ یہ ہے کہ جس قدر نمازی جمع ہوں ان میں سے جو شخص دوسروں کی نسبت قرآن سے زیادہ واقف ہو اسے وہ نمازی امام منتخب کر لیں۔ اس کام کے لئے ایک الگ مستقل آدمی مقرر کر رکھنا خالص بے پایت ہے۔ یہی صورت جمعہ کی نماز اور خطبہ کی ہونی چاہیئے۔ حاضر نمازیوں میں سے جو شخص زیادہ صاحبِ علم ہو وہ لوگوں کو کام کی باتیں بتائے۔ خطبے کے معنی ہی دوسروں کو مخاطب کرنا یا ان سے بات چیت کرنا ہے۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ مساجد میں اسکول قائم کرائے جائیں اور ان کا نظام الاوقات ایسا رکھا جائے کہ نماز کے وقت نمازی ان میں نماز بھی ادا کر لیں۔ اسکول کا مدرس، مسجد کی حفاظت بھی کرے اور وقت پر اذان بھی دے۔ یہ شخص جو اس کام کے لئے اپنا سارا وقت دے گا یقیناً اس کا مستحق ہو گا کہ اس کی ضروریات کی متکفل قوم ہو۔ اس کے لئے یہ معاوضہ بالکل جائز ہو گا۔ اس کی یہ خدمت غیر اسلامی نظام میں بھی، ایک حیثیت سے "دین کی خدمت" تصور کی جائے گی کیونکہ بچوں کو صحیح تعلیم دینا، دین کی خدمت ہے، بشرطیکہ اس تعلیم کو محض "مذہبی تعلیم" تک محدود نہ کر دیا جائے۔ جب ہم مذہبی اور دنیاوی تعلیم کو یک جا کر دیں گے تو وہ دینی تعلیم ہو جائے گی۔

اب رہا تبلیغ کا سوال، سو (اس وقت) یہ خود مسلمانوں کے اندر بھی ہو گی۔ اور غیر مسلموں میں بھی۔ مسلمانوں کے اندر اس لئے کہ مسلمان، قرآن سے بہت دور چلا گیا ہے اور ہمارا مروجہ اسلام، دینِ خداوندی سے کچھ الگ چیز

ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کے سامنے دین کا صحیح تصور لانے کی بے حد ضرورت ہے۔ غیر مسلموں سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس وقت عیسائی مشنریز مسلمانوں کے ممالک میں (سیاسی مقاصد کے پیش نظر) بڑی شدت اور تیزی سے عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف ہیں۔ اس خطرہ کی مدافعت نہایت ضروری ہے۔ ویسے بھی قرآن کریم کے پیغام کو دوسرے انسانوں تک پہنچانا اُمت مسلمہ کا اولین فریضہ ہے۔

اب اگر قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ان مقاصد کے لئے موزوں سمجھے جاتے ہیں، اور ان کا سارا وقت یا اس کا بیشتر حصہ اس کے لئے وقف ہو جاتا ہے، تو اُن کی کفالت بھی بہرحال قوم کے ذمے ہو گی۔ ان سے یہ کہنا کہ حضرات انبیاء کرامؑ کا مسلک یہ تھا کہ "لا اسئلکم علیہ من اجر" ہم اس کے لئے کچھ معاوضہ نہیں چاہتے۔ اس لئے اس خدمت کا معاوضہ لینا انبیاء کرامؑ کے مسلک کے خلاف ہے اس آیت سے بھی غلط استدلال کرنا ہے اور حقیقت سے بھی چشم پوشی۔ لیکن یہ کام کسی تنظیم کے تابع ہونا چاہیئے جو اس کا فیصلہ کرے کہ کس جگہ کس کام کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے کون سا آدمی موزوں ہے۔ اور اس کی کفالت کا انتظام کس طرح ہو گا۔ یہ نہیں کہ جس شخص کا جی چاہے خود ہی یہ کام شروع کر دے۔ اور پھر قوم سے تقاضا کرے کہ وہ اس کی کفالت کا انتظام کرے۔ اس وقت یہ تو ممکن نظر نہیں آتا کہ اس قسم کی کوئی کُلی تنظیم عمل میں آجائے۔ اس لئے سردست اس کا انتظام مختلف اداروں یا جماعتوں ہی کو کرنا ہو گا۔ جو تنظیم، جماعت یا ادارہ ایسے افراد کے سپرد اس قسم کا کام کرے، وہ ان کی ضروریات پوری کرنے کا انتظام بھی کرے۔ ان افراد کے لئے اس قسم کا معاوضہ لینا عیب کی بات نہیں۔

شاید آپ نہیں جانتے

کہ "طلوع اسلام" پاکستان کے علاوہ بائیس غیر ممالک میں بھی پڑھا جاتا ہے۔ اس میں شائع شدہ اشتہارات یورپ اور امریکہ کے قارئین کی نظروں سے بھی گزرتے ہیں، اگر آپ اپنی مصنوعات وغیرہ کو بیرونی ممالک میں روشناس کرانا چاہتے ہیں تو "طلوع اسلام" میں ان کا اشتہار شائع کرائیے

آج ہی ایک کارڈ لکھ کر نرخ اشتہارات طلب فرمائیں۔ (ناظم ادارہ)

اُردو کا عالمی ڈائجسٹ

ماہنامہ انشاء کراچی

دلچسپ حسین ترین تصویروں، دلکش خاکوں، اور رنگا رنگ فیچروں کے ساتھ فوٹو آفسٹ پر نئے سائز میں پیش کیا جا رہا ہے۔

- ★ آپ کے لئے ماہرینِ نفسیات کے قیمتی مشورے اور تحقیقات
- ★ تاریخ کے ناقابلِ فراموش واقعات
- ★ سیاحوں کی سرگزشتیں
- ★ شخصیتیں اور تذکرے
- ★ سائنس کی جدید ترین معلومات
- ★ زندۂ جاوید کتابوں کے خلاصے
- ★ پُراسرار قبیلوں کی داستانیں
- ★ مہمات، شکار اور حادثات
- ★ نامور ہستیوں سے انٹرویو
- ★ دنیا کے فلمی نگار خانوں میں
- ★ نظمیں، افسانے، خاکے اور رپورتاژ
- ★ بین الاقوامی سیاسیات کے جائزے

ماہنامہ انشاء ۱۲۹ (الف) مانک جی اسٹریٹ۔ گارڈن ایسٹ کراچی (۳)

وہ کتاب جس کا مدت سے انتظار تھا دوبارہ چھپ گئی ہے

پرویز صاحب کے مضامین کا مجموعہ، مدت ہوئی

فردوسِ گم گشتہ

کے نام سے چھپا تھا لیکن ایک عرصے سے نایاب تھا۔ اب مصنف کی نظرِ ثانی اور نئی ترتیب کے ساتھ اس کا

نیا اڈیشن

شائع ہو گیا ہے۔ اس میں حسبِ ذیل مضامین شامل ہیں۔

دُنیا کی نجات۔ جنگ۔ فردوسِ گم گشتہ۔ ایمان بلا عمل۔ اسلام اور سائنس۔ خدا کی بادشاہت۔ اسلام اور مذہبی رواداری۔ تمسک بالکتاب۔ کیا تمام مذاہب یکساں ہیں۔ وراثتِ ارض کا ابدی قانون۔ قرآن اور تاریخ۔ مسلمان کی زندگی۔ یہ زمین کس کی ہے۔ قرآن کا معاشی نظام۔ اپنی آنکھ اور قرآن کی روشنی بنجر اور اس کا استعمال

خدا اور قیصر۔

ان میں سے ہر مضمون ایک مستقل دعوتِ انقلاب ہے اور یہ قرآنی مفکر گزشتہ پچیس، تیس برس سے جن ارتقائی منازل سے گزرا ہے اس کی نشان دہی کرتا ہے۔ عجیب و غریب مجموعہ ہے۔

جلد منگا لیجئے۔ سائز ۲۰×۲۶/۱۶ ضخامت ساڑھے تین سو صفحات۔ مجلد حسین گرد پوش۔ کاغذ سفید

قیمت آٹھ روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

اللہ اور رسولؐ کی اطاعت

علامہ حسن الشرباجی السیفوی - رکن
ادارہ فقہ العصر الجدید - مصر

ترجمہ:- سید نصیر شاہ صاحب میانوالی-

"ذیل کا مضمون ماہنامہ "الاسلام" مصر کی تازہ ترین اشاعت میں منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔ طلوع اسلام کے قارئین علامہ السید احمد السیفی کے اسم گرامی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ علامہ حسن الشرباجی انہی کے تحت ادارہ فقہ العصر الجدید میں کام کرتے ہیں۔ وہ علامہ سیفی سے کس حد تک متاثر ہیں اس کا اندازہ اسی بات سے کر لیجئے کہ انہوں نے علامہ سیفی کے اسم گرامی کو اپنے نام کا جزو بنا لیا ہے اور اپنے آپ کو "حسن الشرباجی السیفوی" لکھتے ہیں۔ مضمون زیرِ نظر کو پڑھتے ہوئے اگر آپ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کی تصریحات بھی ذہن میں رکھ لیں تو آپ حیران ہوں گے کہ دونوں حضرات ایک طرح کی آیات سے استدلال کرتے ہوئے کس طرح ایک ہی نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ان حضرات کے نظریات کا ماخذ ایک ہے ــــ اور وہ ہے خدا کی کتاب جس کے متعلق خود خدائے قدوس کا دعویٰ ہے کہ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (س-ن-ش)"

افتتاحیہ استاذی المکرم علامہ السید احمد السیفی کی نگرانی میں جب ہم لوگوں نے عصر جدید کی فقہ ترتیب دینے کا کام شروع کیا تو اولین سوال جو ہمارے سامنے آیا وہ یہی تھا کہ "اللہ اور رسولؐ کی اطاعت" کا مفہوم کیا ہے۔

اہل مصر اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ "ادارہ فقہ العصر الجدید" میں ملک کے نامور علماء شامل کئے گئے ہیں جنہیں مشرقی و مغربی علوم میں پوری مہارت حاصل ہے اور جنہیں اللہ نے علم و دانش کے مراتبِ عظمیٰ کے ساتھ ساتھ قلبِ سلیم کی دولتِ بے پایاں سے بھی مالا مال کیا ہے۔ (اگرچہ کسی حسنِ ظن کی بنا پر میرے جیسے تہی مایۂ علم و دانش کو بھی اس ادارہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔ شاید اسی لئے کہ کلیات مستثنیات سے خالی نہیں ہیں۔) یہ علمائے عصر اور فضلائے دہر کئی دن کی مسلسل

الشرباجی السیفوی جیسا فاضل اور اپنے آپ کو بھی لئے علم و دانش بہ سمجھنے کی کسر نفسی کا مرض ہم مسلمانوں کا پیچھا کب چھوڑیگا ؟ (عیاض الخفاد - ایڈیٹر الاسلام)

کدوکاوش اور بحث وتمحیص کے بعد ایک ہی نتیجہ پر پہنچے۔ میں نے ایک طالب علم کی حیثیت سے ان کے مستدلانہ اور متفقہ نتیجہ کو ترتیب دے کر یہ مضمون تیار کر لیا ہے۔

آزادی کے پروانے

بیسویں صدی کا روشن آفتاب طلوع ہوا تو ہر طرف بیداری حیات کی لہر دوڑ گئی۔ جو قومیں صدیوں سے غلامی کے بندھنوں میں جکڑی پڑی تھیں، ان کے ہاتھوں میں قوت مچلنے لگی، خون میں بجلیاں رقص کرنے لگیں، دل سیماب کی طرح تڑپنے لگے اور رگوں میں کچھ ایسے سیال انگارے دوڑنے لگے کہ غلامی کی آہنی زنجیریں پگھل گئیں اور محکومیت کے بندھن راکھ ہو گئے۔ جن ہاتھوں نے کاسۂ گدائی تھام رکھا تھا، وہ بیباکانہ بڑھے اور ملوکیت کے تاج اُتارنے لگے۔ جن لوگوں کے جذبات سے عاری سینے حاکموں کے لئے فرشِ راہ تھے ان کے قدموں میں مہیب لرزش ہوئی اور ان کی ٹھوکروں سے آقایانِ ولی نعمت کے تخت اُلٹنے لگے۔ غلاموں نے حصولِ آزادی کی خاطر اپنے سر اپنی ہتھیلیوں پر دھرلئے۔ قید و بند کی صعوبات برداشت کیں۔ حاکموں نے ان کے بیباک قدموں کے آگے نارِ جہنم کے دہکتے ہوئے الاؤ بچھائے۔ مگر حریت کے فدائی اور آزادی کے پروانے اس دوزخ کے ایک ایک انگارے کے منہ میں اپنے قلب و جگر کا خون نچوڑتے آگے بڑھتے گئے۔ اور آخر آزادی سے ہم کنار ہو گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے وطن کی تقدیر غیروں کے قبضۂ قدرت میں نہ رہے۔ وہ اپنے ملک کی قسمت کو کسی کے اشارۂ ابرو کا محتاج نہیں رکھنا چاہتے تھے اور آخر ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے اپنی منزل پالی۔ انہیں اپنا مقصود مل گیا۔ آزادی کی مسلم پری ان کے دیس کی دھرتی کو اپنے رقصِ نشاط سے فردوسِ نظر بنانے لگی۔

آزادی کیا ہے؟

مگر جس آزادی کی خاطر اس قدر قربانیاں دی گئیں۔ آخر وہ ہے کیا چیز؟ کیا اسی کا نام آزادی ہے کہ گورے کالوں کی قسمت کا فیصلہ کریں۔ ہم مسلمانوں کے لئے تو آزادی کی یہ تعبیر بالکل مہمل ہے کیونکہ ہم کسی اسود کو احمر پر اور کسی احمر کو اسود پر کوئی فضیلت نہیں دیتے۔ ہم رنگ، نسل، وطن وغیرہ کی حدود کو دیکھ کر قومیت کا فیصلہ ہی نہیں کرتے۔ ہم تو اسلام کو ایک الگ قومیت سمجھتے ہیں۔ اور کفر کو ایک علیحدہ قوم قرار دیتے ہیں۔ پھر آخر آزادی ہے کیا چیز؟ سچ پوچھئے تو اس سوال کا صحیح جواب مفکرینِ مغرب کے پاس بھی نہیں۔ وہ بھی یہی کہہ کر رہ جاتے ہیں کہ آزادی یہی ہے کہ ایک قوم اپنے ملک اور نسل کے اعیان و زعماء کے بنائے ہوئے قوانین کا اتباع کرے۔ لیکن جب انسان کے بنائے ہوئے قوانین کی پابندی ہی مقصود ہو تو پھر اپنے اور غیر کا امتیاز بے معنی ہے۔ آپ کسی ملک کو اپنا ملک کیوں کر کہہ سکتے ہیں۔ جب کہ آپ بھی چند صدی پیشتر وہاں اجنبی کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے اور پھر انسانیت کی یہ تقسیم ہے بھی کس قدر غلط کہ ہم جغرافیہ کے نقشوں کی لکیریں دیکھ کر نسلِ انسانی کے ٹکڑے کرنے لگیں۔ حوادث کا کوئی بے رحم جھونکا آئے گا۔ انقلاب کی کوئی سنگدل آندھی اٹھے گی۔ تغیراتِ روزگار کا کوئی ستمگر تھپیڑا پڑے گا۔ اور تمہارا جغرافیہ بدل جائے گا۔ تمہارے نقشوں کی لکیریں فنا ہو جائیں گی۔ پھر تم کیا کرو گے؟ نیا جغرافیہ مرتب ہو گا۔ نئے نقشے بنیں گے اور

پھر نسلِ انسانی کی قبائے وحدت کو تار تار کرنے بیٹھو گے۔ قومیت و وطنیت کا یہ تصور کتنا غلط ہے اور آزادی کی یہ تعریف کیسی باطل ہے؟

اسلام میں آزادی کا تصور

اسلام میں آزادی کا تصور، باقی اقوام کے تصورات سے بالکل مختلف ہے وہ یہ کبھی گوارا نہیں کرتا کہ انسان انسان کے آگے جھکے۔ آدمی کی پیشانی اپنے ہی جیسے آدمی کے سامنے اطاعت و محکومیت کے سجدے بکھیرے۔ اگر ایک چوپائے پر اپنی جنس کے دوسرے چوپائے کی حکومت نہیں چل سکتی۔ اگر ایک پرندہ اپنی جنس کے دوسرے پرندے کا محکوم نہیں رہتا تو اشرف المخلوق کیوں اپنے جیسے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی اطاعت کرے۔ ایک گدھے نے کبھی دوسرے گدھے کی اطاعت میں سر نہیں جھکایا اور ایک کتے نے کبھی کتوں کی نسل کے لئے قوانین وضع کرکے ان سے اپنی غلامی نہیں کرائی تو انسان کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے جیسے انسانوں کے لئے قوانین وضع کرے۔

پس فی الواقع انسان کی آزادی اسی وقت ممکن ہے جب وہ قومیت و وطنیت کے اطواق و سلاسل کے ساتھ انسانی قوانین کے بندھنوں سے بھی نجات پائے۔

قرآنِ حکیم نے نبی عربیؐ (فداہ نفسی و امی و ابی) کی بعثت کا مقصد یہی قرار دیا کہ

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷)

نبی عربیؐ انہیں اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس سے ان کی پیٹھیں دوہری ہو رہی ہیں اور انہیں ان بندھنوں سے آزاد کرائے گا جن میں وہ گرفتار ہیں۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے

قرآن باقی نظام ہائے عالم کے مقابلہ میں یہ انوکھا تصور پیش کرتا ہے کہ حقیقی آزادی اور سچی حریت یہ ہے کہ انسان صرف خدائے قدوس کی محکومیت اختیار کرے اور اسی کو اپنا حاکم سمجھے۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۚ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ
وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (۱۲/۴۰)

حکومت صرف اللہ کے لئے ہے۔ اس کا حکم ہے کہ صرف اسی کی محکومیت اختیار کرو اور کسی کو اپنا حاکم نہ سمجھو دینِ قیم یہی ہے مگر اکثر لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں۔

خدائے قدوس کی ذات بلند و برتر کے سوا کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ انسان سے اپنی حکومت تسلیم کرائے۔ حاکمیت کا اقتدار اسی کو زیبا ہے جو انسان کا خالق ہے۔ انسان کا مالک ہے اور جس کی کائنات میں انسان زندگی گزار رہا ہے۔ ملک اسی کا ہے اس لئے حکومت بھی اسی کی ہونی چاہیئے۔ اگر کوئی اور جابر ہستی انسانوں پر اپنی حاکمیت کا اقتدار قائم کراتی ہے تو انسانوں کا فرض ہے کہ اس کا انکار کریں۔ کیونکہ قرآن ایسے شخص کو طاغوت قرار دیتا ہے۔

حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری!

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّھُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ (۴/۶۰)

اے پیغمبر اسلام! کیا آپ نے منافقوں کی حالت نہیں دیکھی۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ تم سے پہلے نازل ہو چکا ہے وہ اس پر ایمان رکھتے ہیں لیکن عمل کا حال یہ ہے کہ اپنے تصفیوں میں طاغوت کو حکم تسلیم کرتے ہیں۔ حالانکہ انہیں حکم دیا جا چکا ہے کہ اس سے انکار کریں۔

خدا کا حکومت میں کوئی شریک نہیں

قرآن بڑی صراحت سے بار بار یہ اعلان کرتا ہے کہ حکومت میں اللہ کا کوئی شریک نہیں۔

لَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖٓ اَحَدًا ؁

وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

انبیاء بھی حکومت میں شریک نہیں ہو سکتے

انسانوں پر حکومت کرنا صرف خدائے قدوس کو زیبا ہے۔ انبیاء کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ انسانوں کو اپنا "عبد" بنالیں۔

مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّؤْتِیَہُ اللّٰہُ الْکِتٰبَ وَالْحُکْمَ وَالنُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوْلَ لِلنَّاسِ کُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَلٰکِنْ کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتٰبَ وَبِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ؁ (۳/۷۹)

کسی انسان کو یہ زیبا نہیں کہ اللہ اُسے کتاب حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں کو کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ بلکہ وہ تو یہی کہتا ہے کہ ربانی بنو کیونکہ تم کتاب اللہ کی درس و تدریس میں مشغول رہتے ہو۔

اللہ اور رسول کی اطاعت

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حکومت صرف خدا کے لئے ہے اور مطاع حقیقی وہی ہے تو پھر ان چند آیات کا کیا مفہوم ہوگا جن میں اللہ کے ساتھ رسول کی اطاعت کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اللہ اور رسول دونوں مطاع ہیں۔ اور دونوں کی الگ الگ اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن ایسا سمجھنے والوں نے قرآن کے انداز بیان اور تفسیر الآیات بالآیات کے اصول سے صرف نظر کر لیا ہے۔ یہ تو خود خدائے قدوس ہی سے پوچھنا چاہیئے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت سے مفہوم کیا ہے۔ اگر آپ یہ سوال کتاب اللہ سے پوچھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اللہ اور رسول سے کوئی ایک چیز ہی مراد ہے کیونکہ دونوں کے لئے

واحد کا صیغہ بھی اکثر مقامات پر استعمال کیا گیا ہے۔ حالانکہ عربی کے قاعدے کے مطابق واحد کی بجائے تثنیہ کا صیغہ استعمال ہونا چاہیئے۔

اللہ اور رسول کیلئے واحد کا صیغہ

یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْہُ ——— (۸/۲۰)

اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ اور اس سے روگردانی نہ کرو۔

اس آیت میں اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کا حکم ہے۔ اگر اس سے دو الگ الگ اطاعتیں مقصود ہوتیں تو آگے تثنیہ کا صیغہ "عنھما" آنا چاہیئے تھا۔ لیکن وہاں صرف عَنْہُ آیا ہے۔ جو واحد غائب کا صیغہ ہے۔ پس معلوم ہوا کہ دراصل دونوں سے ایک ہی چیز مقصود ہے۔ ذرا آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے۔

یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ ۔

اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دو جب وہ پکارتا ہے تاکہ تمہیں زندہ کردے۔

اس میں بھی اللہ اور رسول کے الفاظ موجود ہیں لیکن صیغہ تثنیہ کا نہیں بلکہ واحد غائب کا آیا ہے۔ دَعَاكُمْ ایک اور جگہ ہے

وَاِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ لِیَحْكُمَ بَیْنَہُمْ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْہُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ وَاِنْ یَّكُنْ لَّہُمُ الْحَقُّ یَاْتُوْٓا اِلَیْہِ مُذْعِنِیْنَ ۔ (۲۴/۴۸-۴۹)

اور جب وہ (منافقین) اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق منہ پھیر لیتا ہے اور اگر ان کا حق کسی کے ذمہ ہو تو وہ اس کی طرف سر جھکائے چلے آتے ہیں۔

یہاں بھی لِیَحْكُمَ اور اِلَیْہِ میں واحد کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے ذرا آگے ہے۔

قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْہِ مَا حُمِّلَ وَعَلَیْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ وَاِنْ تُطِیْعُوْہُ تَہْتَدُوْا ۭ ط۔

فرما دیجئے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ پھر اگر روگردانی کرنے لگ جاؤ تو سمجھ لو کہ اس کے ذمہ وہ ہے جس کا اس پر بار رکھا گیا ہے اور تمہارے ذمہ وہ طاعت ہے جس کا بوجھ تم پر رکھا گیا ہے اگر تم نے اس کی اطاعت کی تو ہدایت پاؤ گے۔

اس میں اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے لیکن علیہ اور تطیعوہ میں واحد غائب کی ضمیریں استعمال ہوئی ہیں۔ ان آیات میں آپ نے دیکھا کہ اللہ اور رسول کو ایک چیز قرار دیا گیا ہے۔

اللہ اور رسول سے کیا مراد ہے؟

سوال یہ ہے کہ وہ کون سی ایک چیز ہے جسے اللہ اور رسول کا قائم مقام ٹھہرایا

گیا ہے۔ اس امر پر غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اللہ اور رسول سے مراد وہ مرکزِ نظام اسلامی ہے جو قرآنی احکام نافذ کرے۔ چونکہ سب سے پہلے خود رسولِ خدا صلعم نے یہ نظام قائم کیا وہی اس کے سربراہ، امیر اور امام تھے اس لئے وہی سب سے پہلے مرکزِ ملت تھے ان کے بعد خلفائے راشدین نے نظام چلایا۔ اس لئے وہی حضرات مرکزِ ملت تھے اور ان کی اطاعت مسلمانوں پر فرض تھی۔ اب بھی جو حکومت قرآنِ حکیم کو اپنا آئین قرار دے اور جن احکام کے اصول و جزئیات قرآن نے متعین کر دیئے ہیں وہ اسی طرح نافذ کرے۔ اور جو جزئیات غیر متعین ہیں ان کا تصفیہ قرآن کے اصولی احکام اور زمانہ کے تقاضوں کے مطابق کرے تو اس حکومت کی اطاعت بھی اللہ اور رسول کی اطاعت ہوگی۔ جس طرح حضرات صدیقؓ و فاروقؓ کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت تھی۔

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم

اب سورۂ نساء کی اس آیت کو لیجئے جس میں خدائے قدوس نے اسلامی نظام کی پوری وضاحت کر دی تھی مگر جس کا غلط مفہوم لینے سے عجیب طرح کی مشکلات پیدا ہو گئیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی اطاعت کرو جو تم میں صاحبِ حکم ہوں۔ پھر اگر کسی معاملے میں اختلاف ہو جائے تو اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو۔

اس آیت میں علمائے کنزہ[1] قدوری، اللہ سے قرآن مراد لیتے ہیں، رسول سے کتبِ احادیث اور اولوالامر سے حکومتِ وقت اور اس کی تفسیریوں کی جاتی ہے کہ اگر کسی معاملہ میں کسی فرد کو حکومتِ وقت سے اختلاف ہو جائے تو قرآن اور حدیث کو سامنے رکھ کر مناظرہ و مباحثہ ہو۔ اور جو ہار جائے فیصلہ اس کے خلاف ہو۔ ذرا غور کیجئے کہ جس طریق کو یہ لوگ اس قدر اہمیت دے رہے ہیں کیا واقعتاً اگر اسے یہ اہمیت مل جائے تو کوئی نظامِ حکومت باقی رہ سکتا ہے فرض کیجئے کوئی حکومت حدیث ہی کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کرتی ہے کہ تین درہم کی چوری پر چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ چور جب یہ حکم سنتا ہے تو وہ حدیث ہی کی کتابیں اٹھا کر مناظرہ کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے جن میں صاف طور پر یہ بھی موجود ہے کہ دس درہم سے کم کی چوری پر قطعِ ید نہیں۔ حکومت ولی الدبر کی حرمت کا فیصلہ احادیث ہی کی بنا

---

[1] واللہ اس ترکیب سے ان لوگوں پر طنز مقصود نہیں۔ بلکہ مقصد اظہارِ حقیقت ہے۔ آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ ان کے فتاویٰ میں قرآنِ حکیم اور وقت کے تقاضوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ صرف فقہی کتب یا زیادہ سے زیادہ ایک دو حدیثوں کے حوالے ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں علمائے دین کیونکر کہا جائے۔ (الثریا)۔

پر کرتی ہے۔ اور اس کا مرتکب احادیث ہی کی بنا پر کہتا ہے کہ اس میں کوئی قباحت نہیں۔ حکومت فیصلہ کرتی ہے کہ متعہ کے مرتکب کو سزا دی جائے اور متعہ کرنے والا احادیث کی کتابیں بغل میں داب کر حکومت کو مناظرہ کا چیلنج دے دیتا ہے۔ حکومت فیصلہ کرتی ہے کہ مجلسِ واحد میں تین طلاق دینے سے عورت مطلقہ ہو جاتی ہے اور طلاق دینے والا حدیث ہی کی کتابوں سے دلائل لا کر ثابت کر دیتا ہے کہ ایسا کرنے سے صرف ایک طلاق واقع ہوتی ہے۔

ایسی حکومت دُنیا کی عجیب ترین حکومت ہوگی

فی الواقع اگر اس طرح کی کوئی حکومت دنیا کے کسی خطے پہ قائم ہو جائے تو وہ اپنی طرز کی عجیب ترین حکومت ہوگی اور دنیا کی دوسری قوموں کے لئے ایک لطیفہ بن جائے گی۔ ہماری اسی کمزوری کو متعصب پادری اپنے ، فادر نے کس سنگدلی سے اچھالا ہے:

"یہ دور ـــ یہ علم و عقل سے منور دور ـــ میری باتیں سُن کر حیران ہو گا کہ آج بھی کچھ مُلّا اپنے مذہب کو سیاست میں گھسیٹرنے کی احمقانہ کوشش میں لگے ہوئے ہیں ـــ یہ وہ بدخود غلط قسم کے لوگ ہیں۔ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور ان کا دعویٰ یہ ہے کہ مذہب اسلام کی بنیادی کتابوں ـــ قرآن و حدیث ـــ کو سامنے رکھ کر اگر قانون بنایا جائے تو ہماری تمام مشکلات حل ہو سکتی ہیں۔ قرآن و حدیث میں سے حدیث تو ایک ایسی چیز ہے جس میں سینکڑوں کتابیں شامل ہیں۔ ہزاروں صفحات پہ پھیلی ہوئی ہیں۔ اس حدیث کے ذخیرہ میں مہتم بالشان مسائل یہ ہیں کہ کتا اگر کنوئیں میں گر جائے تو پانی کی کتنی بالٹیاں نکالی جائیں کہ وہ کنواں پاک ہو جائے۔ اگرچہ ان مسائل میں بھی احادیث باہم مختلف ہیں۔ مگر سب سے زیادہ اختلاف ان تمدنی مسائل میں ہے جو کہیں کہیں ان کتابوں میں آ جاتے ہیں۔ یہ لوگ ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ صدرِ مملکت کون ہو سکتا ہے۔ بیشتر احادیث میں تو یہ عجیب شرط بیان کی گئی ہے کہ صدرِ مملکت ہر حال میں قریشی ہونا چاہیئے۔ کچھ ایسی احادیث بھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حبشی بھی صدرِ مملکت ہو سکتا ہے ـــ مُلّا کے یہ دعوے کہ اسلام ایک مکمل نظامِ زندگی ہے قطعاً بے بنیاد ہیں۔ ہم دست بدعا ہیں کہ ایسا عجیب و غریب نظام جس میں ہر چیز جائز بھی ہے اور ناجائز بھی، جلد قائم ہو جائے تاکہ دنیا کو قہقہوں کا سامان مل جائے۔ (معاذ اللہ ـ طلوعِ اسلام)

(RELIGION AND POLITICS P. 152)

ہر فرقہ کا رسول الگ ہے (معاذ اللہ)

اگر اطاعتِ رسولؐ سے مراد حدیث ہے تو ماننا پڑے گا کہ معاذ اللہ ہر فرقہ کا رسول الگ ہے۔ کیونکہ ہر فرقہ نے اپنی احادیث الگ بنا رکھی ہیں جنفی جن احادیث کو تسلیم کرتے ہیں شافعی ان سے روگردانی کرتے ہیں۔ اسی طرح

حنابلہ اور مالکیہ بھی ایک دوسرے کی مخالف احادیث سے استناد کرتے ہیں۔ بخاری شریف کی سینکڑوں روایات ہیں جنہیں حنفیہ، شوافعہ، مالکیہ، حنابلہ تسلیم نہیں کرتے۔ باقی کتب احادیث کا بھی یہی حال ہے۔ شیعوں کی احادیث کی کتابیں ہی بالکل الگ ہیں۔ فی الواقع اگر ملاؤں کے شور و غوغا سے کسی ملک میں ایسا نظام قائم ہو گیا تو دکھیا رہی۔ گر معاذ اللہ چند فقیہ مل جائینگے اور وکیلوں کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ کیونکہ یہاں خود احادیث میں ہی ہر طرح کے دلائل مل جائیں گے۔

آیہ محولہ بالا کا صحیح مفہوم

سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس آیہ کریمہ میں اللہ، رسول اور اولوالامر کا مفہوم کیا ہے؟ درحقیقت اس آیت میں اسلامی نظام کا پورا خاکہ بیان کیا گیا ہے جیسا کہ پہلے واضح کیا جا چکا ہے۔ اللہ اور رسول سے مراد مرکز ملت (CENTRAL AUTHORITY) ہے اور اولوالامر سے مقامی حکام مراد ہیں۔ گویا یہاں کہا یہ گیا ہے کہ اگر کسی معاملہ میں مقامی حکام سے اختلاف ہو جائے تو وہیں مناقشہ کا آغاز نہ کر دو۔ بلکہ اس معاملہ کو مرکزی حکومت کے سامنے پیش کرو۔ وہاں سے جو فیصلہ صادر ہو وہ ہر ایک کے لئے واجب التسلیم ہوگا۔ یعنی یہاں مقامی حکام کے فیصلے کے خلاف مرکزی حکومت میں اپیل کا حق دیا گیا ہے۔

اولوالامر سے مراد مقامی حاکم ہیں

ہم نے اولوالامر سے مقامی حاکم یوں ہی مراد نہیں لئے۔ خود قرآن حکیم سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ اسی سورۂ نساء کی ایک اور آیت میں وضاحت کی گئی ہے کہ

وَإِذَا جَاءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى
الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۔

اور جب انہیں امن یا بدامنی کی کوئی خبر ملتی ہے تو یہ اسے لوگوں میں مشتہر کر دیتے ہیں اگر یہ اس کی بجائے اللہ کے رسول اور مقامی حکام کے سامنے یہ خبر پیش کرتے تو جو بات کی تہ تک پہنچنے والے ہیں وہ حقیقت معلوم کر لیتے اور عوام میں بے اطمینانی نہ پھیلتی۔

اس آیت میں رسول کے ساتھ ہی اولوالامر کا وجود تسلیم کیا گیا ہے۔ یعنی نبی صلعم کے زمانے میں بھی اولوالامر تھے۔

پس ثابت ہوا کہ اولوالامر سے مراد مقامی حکام ہیں۔ احادیث سے بھی اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ ہم صرف ایک روایت بیان کرتے ہیں۔

عن حجاج بن محمد قال قال ابن جریج نزل یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ۰ فی عبد اللہ بن حذافۃ بن قیس بن عدی السھمی رضی اللہ عنہ۔ بعثہ النبی صلعم فی سریۃ اخبرنیہ یعلی ابن مسلم عن سعید بن جبیر عن ابن عباسؓ۔

حجاج بن محمد سے روایت ہے کہ ابن جریج نے کہا یہ آیت یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا أَطِیعُوا اللّٰهَ وَأَطِیعُوا الرَّسُولَ ...... الخ عبداللہ بن حذافہ کے بارے میں اتری۔ جب رسول خدا صلعم نے انہیں ایک فوج کا سردار بنا کر بھیجا۔ ابن جریج نے کہا یہ روایت مجھ سے یعلی بن مسلم نے سعید بن جبیر اور ابن عباس کے واسطے سے بیان کی۔ (صحیح مسلم شریف باب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ وتحریمہا فی المعصیۃ)

اس روایت سے ظاہر ہے کہ صحابہ اولوالامر کا کیا مفہوم سمجھتے تھے؟

آگے بڑھنے سے پیشتر گزشتہ مباحث پر طائرانہ نظر ڈال لیجئے۔

خلاصۂ مباحث

۱۔ اصل آزادی خدائی قانون کی پابندی ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ انسانوں کا واحد حاکم ہے۔ وہ اپنی حاکمیت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ حتّٰی کہ انبیاء بھی اس کی حاکمیت میں شریک نہیں۔

۳۔ اللہ اور رسول کی اطاعت کا مقصد ہے اس نظامِ حکومت کی اطاعت جو قرآنی بنیادوں پر قائم ہو۔

۴۔ اللہ اور رسول سے مرکزِ ملت اور اولوالامر سے مقامی حکام مراد ہیں۔

۵۔ مقامی افسروں کے فیصلوں کے خلاف مرکزی عدلیہ میں اپیل کی جا سکتی ہے۔

اب میں اسلامی نظام کے اولین اصول (منصبِ خلافت) اور اس کے متعلقات کے متعلق مختصر خاکہ پیش کرتا ہوں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے یہ خاکہ بھی وہی ہے جو ادارہ فقہ العصر الجدید کے اراکین نے باہمی مشورہ سے طے کیا ہے۔

امیر المومنین کا انتخاب

رسول خدا صلعم مامور من اللہ تھے اس لئے منصبِ خلافت کے لئے ان کے انتخاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے بعد ملت کو اختیار ہے کہ وہ اپنا امام خود منتخب کرے۔ انتخاب کا معیار خدا نے خود تجویز کر دیا کہ

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ۔

اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مکرم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔

امیر المومنین کی اطاعت

ایسا ہی امیر المومنین رسولِ خدا صلعم کا صحیح جانشین ہوگا اور اس کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہو گی۔ اس سلسلے میں سرورِ کائنات صلعم کے واضح ارشادات موجود ہیں۔

عن انس بن مالک قال قال رسول اللہ صلعم اسمعو واطیعوا وان استعمل علیکم

عبد حبشی کان راسه زبیبه (بخاری شریف)

انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تم پر گنجے سر والا حبشی غلام بھی حاکم مقرر ہو جائے۔

جناب ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں۔

ان خلیلی اوصانی ان اسمع واطیع وان کان عبدا حبشیا مجدع الاطراف (مسلم شریف)

میرے دوست رسول خدا صلعم نے مجھے وصیت کی کہ سن اور اطاعت کر اگرچہ حاکم ہاتھ پاؤں کٹا حبشی غلام بھی ہو۔

حضرت عبادہ بن الصامت فرماتے ہیں۔

بایعنا رسول اللہ صلعم علی السمع والطاعة فی العسر والیسر والمنشط والمکرہ وعلی اثرة علینا وعلی ان لا ننازع الامر اهله وعلی ان نقول بالحق اینما کنا لا نخاف فی اللہ لومة لائم۔ (مسلم شریف)

ہم نے جناب رسول خدا صلعم کی بیعت کی سننے اور اطاعت کرنے پر تنگی اور راحت میں، خوشی اور ناخوشی میں چاہے ہمارے حق کا خیال نہ رکھا جائے ہم اس شخص کی سرداری میں جھگڑا نہ کریں گے جو اس کا اہل ہو۔ ہم جہاں بھی ہوں سچ کہیں گے اور اللہ کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کریں گے۔

فقہ شاہ پرستی سکھاتی ہے

امیر المومنین کی اطاعت اس لئے فرض ہے کہ وہ خود کتاب اللہ کا سب سے بڑا متبع ہوتا ہے اور سب سے زیادہ قوانین خداوندی کا پابند۔ اسلام ایک ایسا نظام ہے کہ اس کی عدالت دنیا میں بے مثال ہے۔ آسمان کی آنکھوں نے یہ انوکھے نظارے بھی دیکھے ہیں کہ امیر المومنین عمر فاروقؓ پر دعویٰ کیا جاتا ہے اور وہ خود مدعیٰ علیہ کی حیثیت سے عدالت کے کٹہرے میں آکھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن فقہ حنفی[1] چونکہ اس وقت مرتب ہوئی جب ملوکیت کا استبداد پوری طرح سے اسلام کے اجتماعی نظام میں اپنی جڑیں پھیلا چکا تھا۔ اس لئے اس فقہ میں مسلمانوں کے بادشاہ کے ساتھ خاص قسم کی مراعات روا رکھی گئی ہیں جنہیں انگریزوں کے تصور "بادشاہ کے آسمانی حقوق" (DIVINE RIGHTS OF KINGS) کا چربہ کہنا چاہیئے چنانچہ فقہ حنفی کی جو کتاب آپ دیکھیں گے اس میں یہ عجیب و غریب قانون ملیگا کہ مسلمانوں کا بادشاہ چوری کا

---

[1] امام اعظم ابو حنیفہؒ کے زمانے میں فقہ حنفی کی تدوین نہیں ہوئی۔ فقہ کی کتابیں بہت بعد میں لکھی گئیں اور ان میں بھی اکثر مقامات پر امام اعظمؒ کے اقوال چھوڑ کر صاحبین کے اقوال پر فتویٰ دیا گیا ہے۔ (الفتشہ باقی)۔

—— مرتکب ہو یا زنا کا اس پر کوئی حد نہیں۔ صرف قصاص کے معاملہ میں اس پر حد ہے۔ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں۔

کل شئی صنعہ الامام الذی لیس فوقہ امام فلا حد علیہ الا القصاص۔

مسلمانوں کا بادشاہ جو کام بھی کرے اس پر کوئی حد نہیں سوائے قصاص کے۔

(ہدایہ اولین۔ کتاب الحدود باب الوطی الذی یوجب الحد والذی لا یوجبہ)

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی۔ اب ہم اس موضوع پر غور کریں گے کہ امیر کی اطاعت پر اس قدر زور کیوں دیا گیا ہے؟ اس امر پر غور کرنے سے پہلے یہ سوچئے کہ حکومت کا مقصد کیا ہے؟

حکومت کا مقصد

حکومتیں محض اس لئے قائم کی جاتی ہیں کہ انسان جو ایک متمدن حیوان ہے منظم قسم کی جماعتی زندگی اختیار کرے۔ ایسی جماعتی زندگی اسی وقت ہی نصیب ہو سکتی ہے جب حکومت کے ساتھ مکمل طور پر تعاون کیا جائے مگر حکومت بھی وہی اطاعت کی مستحق ہے جو کتاب اللہ کے مطابق ہو۔ حدیث شریف میں ہے۔

کون سی حکومت اطاعت کی مستحق ہے

عن یحیی بن حصین قال سمعت جدتی تحدث انہا سمعت النبی صلعم یخطب فی حجۃ الوداع وھو یقول ولو استعمل علیکم عبدٌ یقودکم بکتاب اللہ اسمعوا لہ واطیعوا۔ (مسلم شریف)

یحیی بن حصین کہتے ہیں میں نے اپنی دادی سے سنا وہ فرماتی تھیں کہ میں نے رسول خدا صلعم سے سنا۔ انہوں نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا اگر تم پر ایک غلام بھی حاکم مقرر ہو جائے جو کتاب اللہ کے مطابق تم پر حکومت کرے تو اس کا حکم سنو اور اس کی اطاعت کرو۔

کتاب اللہ کے احکام غیر متبدل اور صریح ہیں اگر لوگ روایات سے بے نیاز ہو کر پڑھا جائے تو ہر شخص ان سے ایک ہی قسم کا مطلب اخذ کرے گا۔ لیکن اگر آپ حدیث کو بھی شامل کر لیں تو پھر لامحالہ یہی کی وہ شکل قائم ہو گی کہ بنا و بجدا حکومت کو ہر حکم نافذ کرنے سے پہلے مولویوں کا منہ تکنا پڑے گا کہ کہیں وہ اسے خلاف اسلام قرار دے ڈالیں بلکہ مولویوں نے اس طرح کا منصب بہت پہلے سے اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ چنانچہ امام نووی لکھتے ہیں۔

"بعض نے کہا اولوالامر سے حکام مراد ہیں اور بعض نے کہا کہ اولوالامر جن کی اطاعت فرض کی گئی ہے وہ یہی علماء ہیں" (شرح مسلم للنووی باب طاعۃ الامراء)

علماء کی طرف سے یہ بات بھی پیش کی جاتی ہے کہ امام کی اطاعت صرف معروف میں ہو گی، منکر میں نہیں۔ سوال پیدا ہوا کہ معروف کا تعین کون کرے گا؟ جواب ملا کہ صرف علماء کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ معروف کا تعین کریں۔ گویا اصل حکومت مولویوں کی ہوئی کہ جس چیز کو معروف قرار دیں وہ معروف ٹھہرے اور جس کو منکر کہدیں وہ منکر قرار پائے۔ یہ نقشہ کہیں کی

وہی شکل ہے جس نے یورپ میں جنم لیا تھا اور مظالم کی انتہا کر دی تھی۔ یورپ بیدار مغز تھا۔ اس نے جلد ہی اس سے پیچھا چھڑا لیا۔ لیکن اگر کسی اسلامی ملک میں اس چیز نے جنم لے لیا تو پھر اسلام کا وہ رہا سہا وقار بھی دنیا میں ختم ہو جائے گا۔ جو بعض سنجیدہ الخیال مفکرین کی کتب سے قائم ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو چیز قرآن کی منشا کے مطابق ہے وہ معروف ہے اور جو اس کے خلاف ہے وہ منکر ہے۔ پس اگر کوئی امیرالمومنین صریح طور پر قرآن کے احکام کی خلاف ورزی نہیں کرتا تو وہ واجب الاطاعت ہے تاکہ امت میں اتحاد باقی رہے۔ مرکزیت قائم رہے۔ اس وحدت ملی کی بدولت وہ ترقی کرتی چلی جائے۔

جماعتی زندگی

ہر قوم کی ترقی کا راز اجتماعیت میں ہے۔ جب کسی قوم کے افراد میں وحدت فکر و عمل پیدا ہو جائے تو دیکھتے دیکھتے وہ آسمان پر پہنچ جاتی ہے۔ قرآن حکیم نے اسی لئے وضاحت کر دی کہ مسلمانوں کو ہمیشہ ایک جماعت رہنا چاہیئے۔ نہ ان میں مذہبی فرقہ بندیاں ہوں نہ سیاسی پارٹی بازیاں۔ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا۔ سب مل جل کر اللہ کی رسی (قرآن) کو مضبوطی سے پکڑے رکھو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

مذہبی و سیاسی گروہ بندی شرک ہے

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ۔

جن لوگوں نے دین میں تفریق کی اور گروہ گروہ ہو گئے۔ ان سے اے رسول تیرا کچھ تعلق نہیں۔

اس قرآنی آیت کی تفسیر میں حضرت فاروق اعظمؓ فرماتے ہیں کہ نبی صلعم نے ام المومنین عائشہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

یا عائشۃ إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا هم اصحاب البدع والاھواء

لیس لھم توبۃ انا منھم بری وھم منی براء۔ (جامع الصغیر للطبرانی)

اے عائشہؓ! جو لوگ دین میں فرقے پیدا کرتے ہیں اور مختلف گروہوں میں بٹ جاتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو دین میں نئی چیز پیدا کرتے ہیں اور اپنی خواہشات کے بندے ہیں ان کی توبہ بھی کچھ نہیں۔ میں ان سے اور وہ مجھ سے بری ہیں۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا۔

اے مسلمانو! ان مشرکوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے دین میں تفریق پیدا کر لی۔ اور گروہ گروہ ہو گئے۔

یہاں سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اسلامی نظام میں کسی کو یہ اجازت نہ ہو گی کہ وہ مذہبی گروہ بندیاں قائم کرے یا

سیاسی پارٹیاں بنائے۔ اُمّت کا نظام عقیدہ و عمل ایک ہوگا۔ پوری امت ایک سیاسی پارٹی ہوگی۔ آج کل عام طور پر یہ نعرے بلند کئے جاتے ہیں کہ اسلامی فرقوں کے پرسنل لار کی محافظت کا تقاضا یہ ہے کہ تمام فرقوں کی فقہ یا شریعت کو آزادی ہونی چاہیئے۔ یعنی پرسنل لار ہر فرقہ کے الگ ہوں۔ یہ نعرے اسلام کے نام لیواؤں کی طرف سے جب بلند کئے جاتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے کہ یہ لوگ اسلام سے کس قدر ناواقف ہیں۔ مسلمانوں میں الگ الگ پرسنل لار دراصل انگریزوں کی شرانگیزی کی یادگار ہے۔ دین اسلام میں فرقوں کے وجود کی کوئی گنجائش نہیں۔ رسول خدا صلعم اور خلفائے راشدین کے دور میں صرف ایک قانون تھا۔ ملکی اور شخصی قوانین الگ نہ تھے۔ ایسا قانون جس میں سینکڑوں فرقوں کو آزادی کی ضمانت دی گئی ہو، وحدتِ اُمّت کے سراسر منافی ہے۔ صرف غیر مسلموں کو یہ رعایت دی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے مذہبی مناسک کو محفوظ رکھیں۔ ملکی قوانین ان کے بھی یہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں۔

تمسک بالجماعت

چونکہ وحدتِ امت ہی دین کا اصل الاصول ہے۔ اس لئے نبی صلعم کے بیشتر تاکیدی ارشادات اس ضمن میں وارد ہوئے ہیں ارشاد ہے۔

"میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا مجھے اللہ نے حکم دیا۔ جماعت، سمع، طاعت، ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ۔ یقین کرو جو مسلمان بالشت بھر جماعت سے الگ ہوگیا اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور جس نے جاہلیت کی زندگی یعنی انتشار و افتراق کی طرف دعوت دی تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو اور روزے رکھتا ہو؟ آپ نے فرمایا ہاں! چاہے وہ نمازی اور روزہ دار بھی ہو اور اپنے آپ کو مسلمان بھی سمجھتا ہو"

(مسند احمد۔ مستدرک حاکم)

ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا

"جو شخص اطاعت سے الگ ہوگیا اور جماعت کو چھوڑ بیٹھا تو وہ جاہلیت کی موت مرا"

(مسلم شریف)

ایک اور حدیث ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا۔

"جو شخص جماعت سے بالشت بھر بھی باہر جائے گا اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی" (بخاری شریف)

ایک اور مقام پر آپ نے فرمایا۔

"اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔ جو جماعت سے الگ ہوا وہ جہنم میں گرا" (ابن ماجہ شریف)

لہ غور کیجئے مولوی صاحبان مصر میں ہوں یا پاکستان میں سب کی ذہنیت ایک ہی ہوتی ہے۔ (طلوع اسلام)

اجتماعی نظام میں افتراق پیدا کرنے والے کی سزا!

اور جو شخص امت کے اجتماعی نظام میں انتشار پیدا کرنے کی دعوت دے اس کی سزا بھی رسولِ اکرمؐ کی زبانِ صداقت ترجمان سے سن لیجئے۔ آپ نے فرمایا!

"جو شخص تمہارے پاس آئے اس وقت جب تمہارا نظام ایک امیر کے تابع قائم ہو اور وہ چاہے کہ تمہارے اجتماعی نظام میں افتراق پیدا کرے تو اسے قتل کر دو۔" (مسلم شریف)

ایک اور مقام پر ہے۔

"عرفجہ کہتے ہیں میں نے رسولِ خدا سے یہ ارشاد سنا کہ عنقریب بڑے فتنے رونما ہوں گے۔ پس اگر کوئی شخص امت کے سیاسی نظام میں اختلال پیدا کرنا چاہے اور امت متفق ہو چکی ہو تو تلوار سے اس کی گردن اڑا دو" (مسلم شریف)

شاہ ولی اللہؒ مرحوم ایسی متعدد روایات نقل کر کے لکھتے ہیں۔

"جب کسی شخص کے لئے بیعت منعقد ہو جائے اور اس کی حکومت قائم ہو جائے پھر اگر کوئی دوسرا آدمی خروج کرے تو چاہیئے کہ اس دوسرے کو قتل کر دو خواہ وہ پہلے سے افضل ہو یا مساوی یا کمتر۔" (ازالۃ الخفا جلد اول)

تمسک بالجماعت کا یہی وہ عظیم القدر نظریہ تھا جس کی بنا پر یہ حکم دیا گیا کہ جب تک امیر سے "کفر بواح" (کھلم کھلا کفر) ظاہر نہ ہو اس کی اطاعت فرض ہے۔ چنانچہ حضرت عبادہ بن امیہ کہتے ہیں۔

امیر کی اطاعت

"ہم لوگ حضرت عبادہ بن الصامت کی خدمت میں حاضر ہوئے وہ اس وقت علیل تھے۔ ہم نے عرض کیا، اللہ آپ کو سلامت رکھے کوئی ایسی حدیث بیان فرمایئے جو نفع بخش ہو اور آپ نے نبی صلعم سے سنی ہو۔ انہوں نے فرمایا۔ ہمیں رسولِ خدا صلعم نے طلب فرمایا اور جن امور پر بیعت لی ان میں یہ بھی تھا کہ ہم امیر کی بات سنیں گے۔ اور اس کی اطاعت کریں گے چاہے اس کی بات ہمیں پسند ہو یا ناپسند۔ اس پر عمل مشکل ہو یا سہل۔ اور اس کے لئے ہمیں کچھ قربانی ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ اور یہ کہ حکومت کے معاملہ میں ہم برسرِ اقتدار شخص سے جھگڑا نہ کریں جب تک اس سے کھلم کھلا کفر ظاہر نہ ہو اور اللہ کی طرف سے اس بارے میں قطعی دلیل موجود نہ ہو۔

(بخاری۔ کتاب الفتن)

یعنی اطاعت معروف میں ہوگی منکر میں نہیں۔ مگر منکر وہی ہے جسے حدیث میں کھلم کھلا کفر کہا گیا ہے اور جس کے متعلق اللہ کی طرف سے قطعی دلیل موجود ہو جائے۔ اس معاملہ میں امام اعظمؒ صاحب کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ

لا نری الخروج علی الائمۃ ولو جاروا

ہم حاکمانِ وقت کے خلاف خروج جائز نہیں سمجھتے۔ اگرچہ وہ ظلم کریں[1]۔

ائمہ ثلٰثہ کا بھی یہی مسلک تھا جیسا کہ ان کے عمل سے ظاہر ہے۔ امام ابن تیمیہؒ نے جمہور اہلِ سنت کا یہی مسلک قرار دیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"اہلِ سنت کا یہ معروف مسلک ہے کہ وہ حاکمانِ وقت کے خلاف خروج اور قتال بالسیف کو ناجائز سمجھتے ہیں چاہے وہ لوگ ظلم بھی کریں۔ اور اس پر احادیث صحیحہ بھی دلالت کرتی ہیں۔ کیونکہ حاکمانِ وقت سے جنگ کرنے کا فساد اس فساد سے بڑھ کر ہے جو بغیر قتال کے ان کے ظلم کی وجہ سے پیدا ہو"

(منہاج السنۃ النبویہ ج ۲)

[اس کے بعد انہوں نے اس نکتہ کی مزید وضاحت کی ہے جسے ہم نے بغرض اختصار حذف کر دیا ہے۔ طلوع اسلام]

بہر حال ہم عرض یہ کر رہے تھے کہ اسلامی نظام میں کسی قسم کی سیاسی پارٹی یا مذہبی گروہ بندی کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ مسلمان ایک قوم کا نام ہے۔ اس قوم کے اندر پھر کیسے مختلف قومیں گوارا کی جا سکتی ہیں۔ اسلام ایک اجتماعی سیاسی نظام کا نام ہے اس میں پھر کیسے مختلف سیاسی پارٹیاں برداشت کی جا سکتی ہیں۔

خلاصہ مباحث

مباحث گزشتہ پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر ہم اس مضمون کو ختم کرتے ہیں۔

۱۔ اسلامی نظام میں انتخابِ امیر کا معیار ہوگا ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔

۲۔ امیر کتاب اللہ کی اطاعت کرے تو اس کی اطاعت مومنوں پر فرض ہے۔

۳۔ اسلام ایک اجتماعی نظام کا نام ہے اس میں مذہبی و سیاسی گروہ بندیوں کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ امیر کے خلاف خروج اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک اس سے صریح کفر صادر نہ ہو۔

---

[1] جمہوری اور آئینی دور میں قوم کی طرف سے خروج (بغاوت) کا سوال ویسے ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب ایسی زیادتیوں کا مداوا آئینی طور پر کیا جا سکتا ہے۔ طلوع اسلام۔

مفت دوا برائے ــــــ دمہ، دردِ گردہ و پتھری

ملنے کا پتہ

حاجی محمد دین شیخ آئس فیکٹری متصل گنیش کھوپرا ملز۔ لارنس روڈ۔ کراچی۔

اپنے پتہ کا لفافہ بھیج کر دوا مفت منگا لیں

پٹ سن کی مصنوعات تیار کرنے والوں میں

★ ایک ممتاز اور نمایاں مقام کے حامل ★

لطیف باوانی جوٹ ملز لمیٹڈ

ڈھاکہ

اس ادارہ کے تیار کردہ تھیلے، بوریاں، سوتلیاں اور ثاٹ کی دیگر اشیاء، وکینواس دُنیا کے مختلف گوشوں میں بھیجے جاتے ہیں اور دُنیا کے ہر حصے میں ویسے ہی مقبول عام ہیں جیسے اپنے گھر میں۔

مینیجنگ ایجنٹس

احمد برادرز لمیٹڈ ۳۵-۳۶ جناح ایوینو -

رمنا ــــ ڈھاکہ (۲)

تاد کا پتہ :- "باوانی" ــــ فون نمبر ۲- ۶۷۳۱

کراچی آفس ــــ بینک ہاؤس حبیب اسکوائر بندر روڈ کراچی

نقد و نظر

انسان

"ڈاکٹر صاحب! کیا آپ نے اس ماہ کے طلوع اسلام کے لمعات پڑھے ہیں؟"

"نہیں بھائی! ابھی تک نہیں پڑھ سکا۔ طلوع اسلام یوں تو میرے میز پر ہر وقت سامنے رہتا ہے لیکن مصروفیت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اس کے ورق الٹنے تک کی فرصت نہیں ملتی۔ اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ ہم سائنس کے اسٹوڈنٹس کی حالت عجیب ہوتی ہے۔ چونکہ طالب علمی کے زمانے میں اردو، فارسی سے کوئی لگاؤ نہیں رہتا اس لئے اُردو کے مضامین پڑھنے کا خیال آتے ہی طبیعت میں عجیب سی اُلجھن پیدا ہونے لگ جاتی ہے"

یہ درست ہے ایک ڈاکٹر کی مصروفیات بھی بہت ہوتی ہیں، اور اردو، فارسی سے اسے لگاؤ بھی نہیں ہوتا۔ لیکن وہ جو علامہ اقبال نے کہا تھا کہ

جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اس کا بین ثبوت ہمیں، زیر تبصرہ کتاب کے مصنف کی زندگی سے ملتا ہے۔ یہ قریب پانسو صفحات پر پھیلا ہوا ناول ہے جس کی زبان شگفتہ اور انداز بڑا صحت مند ہے۔ اور اس کے لکھنے والے ہیں ڈاکٹر صلاح الدین اکبر جو پی۔ ایچ۔ ڈی والے ڈاکٹر نہیں، ایم۔ بی۔ بی۔ ایس والے ڈاکٹر ہیں اور یہی ان کا ذریعہ معاش بھی ہے۔ اب آپ سوچئے کہ جو ڈاکٹر اپنی گوناں گوں مصروفیات کے باوجود، ایسی کتاب کی تصنیف کے لئے وقت نکال سکتا ہے۔ (اور یہ ان کی پہلی کتاب ہی نہیں۔ اس سے پہلے ان کا ایک اور ناول ۔۔۔ چھپ اور آنسو ۔۔۔ شائع ہو چکا ہے اور اس کے علاوہ ان کے افسانے بھی عام طور پر شائع ہوتے رہتے ہیں) اور عمر بھر سائنس کا اسٹوڈنٹ رہنے کے باوجود اردو زبان پر بھی اس قدر قدرت رکھتا ہے۔ اس کے ذوقِ یقین کے متعلق کیا کلام ہو سکتا ہے؟

طلوع اسلام میں ایک "ناول" پر تبصرہ شاید سطحی بین نگاہوں میں عجیب سا نظر آئے۔ لیکن ناول ہو یا افسانہ، نثر ہو یا نظم ـــ حتیٰ کہ مصوری ہو یا موسیقی۔ ان میں سے کوئی شے بھی فی نفسہٖ نہ حرام ہے نہ حلال، نہ جائز ہے نہ ناجائز۔ یہ سب انسانی خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔ جس قسم کے خیالات ہوں گے، اسی نسبت سے ان ذرائع اظہار کے جائز اور ناجائز ہونے کا فیصلہ ہوگا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں

سرود و شعر و سیاست۔ کتاب و دین و ہنر ـــــ

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ!

اس ناول کو ہم نے اس لئے درخورِ تبصرہ سمجھا ہے کہ جو کچھ اس میں کہا گیا ہے وہ اصولاً اُسی قرآنی دعوت کی ترجمانی کرتا ہے جسے طلوع اسلام شروع سے پیش کرتا چلا آرہا ہے۔

ملک کے اور ہزاروں، لاکھوں درد مند انسانوں کی طرح، ڈاکٹر صاحب بھی یہ تصور لئے ہوئے تھے کہ ہمیں یہ خطۂ زمین عطا ہوا ہے تو اس میں ایسے معاشرہ کی تشکیل ہونی چاہیئے جس میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے۔ لیکن یہاں جو کچھ اس وقت تک ہوا اس نے ان ہزاروں، لاکھوں انسانوں میں سے بیشتر کو مایوسی کی تاریکیوں میں دھکیل دیا۔ مقامِ مسرت ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے آپ کو ان مرگ آفریں اثرات سے محفوظ رکھا ـــــ ورنہ ایک صاحبِ قلم اگر مایوسی کا شکار ہو جائے تو وہ تنہا ہی نہیں ڈوبا کرتا۔ بستیوں کی بستیوں کو ساتھ لے کر تباہ ہوا کرتا ہے ـــ ڈاکٹر صاحب نے اپنے ناول کے "زندگی سے مایوس کردار" کو خودکشی سے بچا لیا۔ اور وہ مسلسل تگ و تاز کے بعد ایک ایسی بستی بسانے میں کامیاب ہو گیا جو مصنف کے تصورِ پاکستان کا، ایک چھوٹے سے پیمانے پر، حسین مرقع ہے۔ اس آبادی کا نام ـــ رحمٰن بستی ـــ خود اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے خدا کی صفتِ رحمانیت کو کس عمدگی سے سمجھا ہے۔ سنئے کہ اس بستی کا رہنے والا دیہاتی کسان، اس کی خصوصیت کیا بتاتا ہے۔ وہ نو وارد سے کہتا ہے۔

"ہمارے ہاں بھائی اس گاؤں میں قصہ یہی چل رہا ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ زمین میری ہے، اس لئے فصل میری ہے۔ ایک کہتا ہے بیج میں نے ڈالا، ہل میں نے چلایا، پانی میں نے دیا ـــــ فصل میری ہے ـــــ حالانکہ نہ زمین اس کی ہے نہ فصل اس کی، نہ محض محنت کرنے والے کی، زمین کا تو ایک ہی مالک ہے۔ اور محنت، بیج، پانی ـــ یہ پانی کہاں سے آتا ہے، یہ بادلوں کے ٹکڑوں کو موتیوں کے ان دانوں سے، آبِ حیات کے ان قطروں سے کون بھر دیتا ہے ان کو آسمانوں پر کون بھگا کے بھگا کے لئے پھرتا ہے اور دریاؤں کا رُخ کون مقرر کرتا ہے ـــــ"!

"مگر دریاؤں کا رخ بدل کر، نہریں کاٹ کر پانی دیتے ہیں۔ زمین کی تہ سے پانی نکالتے ہیں ـــــ جو بلا کی سردی اور قیامت کی گرمی برداشت کرتے ہیں۔"

"محض اپنا فرض ادا کرتے ہیں" ـــــ میں کہتا ہوں، وہ یہ سب کر سکتے ہیں۔ اور سورج ہفتوں غائب ہو جائے ـــــ ادھر خوشوں میں دانے آئیں، ادھر اولے پڑ جائیں ـــــ یہ کس کے اختیار میں ہے کہ موسموں کے تغیر و تبدل میں حارج ہو جائے ـــــ"!

"تو اس گاؤں کی زمین کس کی ہے؟" اجنبی نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"زمین کا مالک تو ایک ہی ہے ـــــ یہ ٹکڑا البتہ ہماری تحویل میں ہے۔ ہم سب کے ذمے اس کا بونا، بیجنا، فصل اگانا اور کاٹنا ہے اور اس سے فائدہ اٹھانا۔"

پھر اس نے بتایا کہ

"ان چند سالوں میں ہمارے پاس کافی پیسے جمع ہو گئے ہیں۔ زمین بھی ہمارے پاس ابھی ہے۔ بجلی آگئی ہے۔ اب ہمارا خیال ہے کہ یہاں کوئی کارخانہ لگایا جائے۔ ابھی ہم مشورہ کر رہے ہیں کس چیز کا کارخانہ مناسب ہوگا۔ فیصلہ ہو گیا تو اس کے متعلق ضروری اقدام شروع کر دیں گے۔"

"اس کا مالک کون ہوگا؟"

"رحمان بستی"!

"اور اس کا منافع کس کے گھر؟"

"رحمان بستی کے نام"!

"پھر بھی، کیا کوئی ملازم اس کا ذمہ دار ہوگا، کوئی عہدہ دار!"

"ایک امین تو ہوگا جسے گاؤں والے کہیں گے ـــــ نیاز صاحب ہوں، اصغر حسین ہو، غلام رسول ہو، احمد دین ہو یا کوئی اور! جو اس ذمہ داری کو اٹھا سکتا ہو، یہ بوجھ ہی ہوگا کوئی تمہارے لوگوں کا عہدہ نہیں ہوگا ـــــ اور جو ٹھیک سے عہدہ برا ہو سکتا ہوگا وہی سامنے آئے گا۔ اسی کو گاؤں والے اجازت دیں گے!"

یہ ہے وہ رحمان بستی جس میں کام کرنے والے مزدور سے ایک اجنبی پوچھتا ہے۔

"نور دین۔ تم کو اگر یہاں سے دگنے پیسے کسی اور جگہ کام کرنے کے دیئے جائیں تو تم وہاں چلے جاؤ گے؟"

اب نور دین کا جواب سنئے۔

"نہیں بھائی صاحب، یہاں سے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، میری ضروریات کے لئے تب بھی کافی

مل رہا ہے۔ میرے بچوں کو ترقی کے سب مواقع ہیں۔ یہاں ان کی سب کے برابر عزت ہے، یہاں میری بھی عزت ہے ــــــ یہاں مجھے یہ یقین ہے کہ اگر میں آج بھی مر جاؤں تو نہ میری بیوی کو کوئی معاشی دقت ہوگی نہ بچوں کو، نہ ان کی تعلیم رک سکے گی نہ ان کی عزت میں کمی آجائے گی ــــــ یہ مجھے اور کہاں میسر ہو سکتی ہے! پھر میں اس بستی کو چھوڑ کر کیوں جاؤں"؟

ایک مقام پر ڈاکٹر صاحب نے وہ اہم سوال بھی اٹھایا ہے جو نظام سرمایہ داری کے پاس گویا، "ترپ کے پتہ" کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا انہوں نے جواب بھی دیا ہے۔ سوال اور اس کا جواب آپ مصنف کے اپنے الفاظ میں سنئے۔

(سوال) جب ان کا درمیان کچھ ملتا ہے جو پہلے ملتا تھا تو پھر ان کو کیا ضرورت پڑی ہے اتنا زیادہ کام کرنے کی جیسے یہاں ہر کوئی زیادہ سے زیادہ وقت کام کرتا ہے ــــــ جھگڑے فساد بھی ختم ہو گئے ہیں"!

(جواب) "وہ کیوں لڑیں! کوئی کسی سے بے انصافی نہیں کرتا۔ جہاں ہر کوئی دوسرے کو فائدہ پہنچا کر خوشی محسوس کرتا ہو وہاں لڑائی جھگڑوں کا کیا کام؟ اور کام بھی، ہر ایک کو معلوم ہے کہ اس کی زندگی آرام اور سکھ میں گذر رہی ہے۔ لیکن اس کے کام کرنے سے ان کا مستقبل تابناک ہو سکتا ہے"!

"مستقبل"!

"ہاں، اولاد میں خود تمہاری زندگی بھی جاری رہتی ہے ــــــ جو پودا تم لگاتے ہو تمہاری اولاد اس کا پھل کھاتی ہے۔ نیکی کا جو بیج تم بوؤ گے وہ تمہاری اولاد کے کام آئے گا۔ جو تعلیم و تربیت ان کو دو گے جو ماحول تم ان کے لئے بنا جاؤ گے وہ آیندہ معاشرے کی تشکیل کے لئے نمونہ ہوگا ــــــ!

اور ہمارے یہاں کا ماحول ــــــ تم چند دن یہاں رہ کر دیکھو ــــــ ہر ایک کو ایک سا ماحول میسر ہے۔ ہر ایک کو تعلیم کے ایک سے مواقع ہیں۔ ماسٹر احمد دین کا بیٹا اگر ہوشیار ہے، اگر اس میں صلاحیت ہے کہ وہ ولایت سے الیکٹریکل انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر کے ملک کے لئے زیادہ مفید ثابت ہو سکتا ہے تو وہی ولایت جائے گا، اختر کا، امجاد کا یا نیاز صاحب کا بیٹا نہیں؟

ــــــ پھر وہ سب کام کیوں نہ کریں گے، مستقبل کے درخشاں ہونے کی اور کیا ضمانت ہو سکتی ہے۔ بچے بھی ذرائع کی کمی کی وجہ سے بددل نہ ہوں گے۔ برہمن کا لڑکا ہی پڑھنے لکھنے کا حق نہیں رکھتا، یہ سبھوں کا حق ہے۔ ہمارے یہاں یہ نہیں ہوگا کہ برہمن برہمن ہی رہے گا اور شودر، شودر! زمیندار کا بیٹا ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکے گا۔ سکول ماسٹر کا نہیں"!

اس مقام پر ڈاکٹر صاحب نے "مستقبل" کی وسعت کو صرف "آیندہ نسلوں" تک ہی جا سکے۔ اس سے آگے نہ بڑھے۔ ان میں خبر نہیں کہ یہ بھی "مستقبل" ہے ــــــ بلکہ خود ایک فرد کی زندگی میں۔ اس کا اگلا سانس اس کے لئے مستقبل کی حیثیت رکھتا ہے۔

لیکن "مستقبل" اس دنیا کی زندگی پر ختم نہیں ہو جاتا ــــ خواہ وہ زندگی فرد کی ہو یا نوعِ انسانی کی۔ انسانی مستقبل کی حدیں اس سے آگے بڑھتی ہیں اور مرنے کے بعد کی زندگی کو بھی اپنے احاطہ میں لے لیتی ہیں۔ اور مستقبل کا یہی تصور اس اعتراض کا جامع اور بلیغ جواب بھی ہے جو نظام سرمایہ داری کی طرف سے نظامِ ربوبیت کے خلاف عائد کیا جاتا ہے۔ قرآن کا دیا ہوا تصور یہ ہے کہ

(۱) انسانی ذات، جسم کی موت کے بعد بھی زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے۔

(۲) جس طرح انسانی جسم کی نشو و نما کے لئے قوانین مقرر ہیں، اسی طرح انسانی ذات کی نشو و ارتقاء کے لئے بھی قوانین متعین ہیں۔

(۳) انسانی جسم کی پرورش اس سے ہوتی ہے جسے انسان کھاتا ہے۔

(۴) لیکن ذات کی نشو و نما اس سے ہوتی ہے جسے انسان دوسروں کی پرورش کے لئے دیتا ہے۔

(۵) اس تصور پر یقین رکھنے والا مردِ مومن زیادہ سے زیادہ محنت کر کے کماتا ہے اور اپنے لئے کم از کم رکھ کر باقی سب دوسروں کی پرورش کے لئے دے دیتا ہے تاکہ اس سے اس کی ذات کی نشو و نما ہو سکے۔ اور وہ اس زندگی کے بعد کی منازل بحسن و خوبی طے کرنے کے قابل ہو سکے۔

یہ ہے وہ ایمان جو اس عمل کا محرک بنتا ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ محنت کرے خواہ اسے اس میں سے کم از کم ہی کیوں نہ ملے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس قسم کے مابعد الطبیعیاتی مسائل کو درمیان میں لانا مناسب نہیں سمجھا، شاید اس لئے کہ ناول کی فضا ایسے دقیق مباحث کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ یا شاید اس لئے کہ یہ جواب ایک دیہاتی کاشتکار کی طرف سے دیا جا رہا تھا۔ جس کی زبان سے اس قسم کا فلسفیانہ جواب اوپرا سا دکھائی دیتا۔

ہم نے مصنف کی طرف سے اس "جواب دعوے" کو خود ہی اس لئے پیش کر دیا ہے کہ وہ ملّت کے اختر ایکیوں کی طرح زندگی کو محض آب و گِل کا کھیل نہیں سمجھتے۔ وہ وحی کی مستقل اقدار پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

ایٹم اور خلا کے اس دور میں اگر سائنس کے منہ زور گھوڑوں کی لگام تھامنے کے لئے کوئی مستقل قدریں نہ ہوں گی۔ مادی ترقی کے علاوہ بھی انسانی بلندی کے کچھ معیار نہ ہوں گے اور ان کے نام لیوا اپنے نورِ بصیرت سے اسے راستہ نہ دکھائیں گے تو شاید انسانیت ہی کا نام و نشان مٹ جائیگا۔

(انہی اور ایسی ہی اقدار کو زندگی ہی جگہ دینے کے لئے ایک نئی سرزمین (پاکستان) کی ضرورت محسوس کی گئی تھی)۔

ادارہ کہ

اسلام نے مٹی اور پتھر کے بُت ہی نہیں توڑے تھے۔ خیالات اور تصورات پر چھائے ہوئے بھی اوہام اور مجلسی اور اقتصادی زندگی پر قابض سبھی خداؤں کا طلسم توڑا تھا۔ (حرفِ آخر)

ہم ڈاکٹر صلاح الدین اکبر کو درخور مبارکباد سمجھتے ہیں کہ فطرت نے انہیں ایسا حساس قلب، متوازن ذہن اور بلند نگاہ عطا کی ہے اور اس کے ساتھ ہی ایسا حسین قلم جو ان کے دل کی دھڑکنوں اور دماغ کی کاوشوں کو دوسروں تک پہنچانے کا بڑا موثر ذریعہ ہے۔ ہم ڈاکٹر صاحب سے درخواست کریں گے کہ

برآور ہرچہ اندر سینہ داری
سرودے، نالۂ، آہے، فغانے

کتاب جس کا صوری حسن بھی مصنف کے ذوقِ سلیم کا آئینہ دار ہے، اردو پبلشرز۔ کاچھو منزل۔ جمال پارک۔ مصری شاہ۔ لاہور سے ۱۰ روپے میں مل سکتی ہے۔

۲۔ دستورِ معاش

راولپنڈی کے چودھری محمد اسمٰعیل صاحب کو اسلامی معاشیات سے بڑی دلچسپی ہے اور وہ اس سلسلہ میں وقتاً فوقتاً مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں اور رسائل بھی شائع کرتے ہیں۔ زیرِ نظر پمفلٹ اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ سودی نظام انسانیت کی بدترین لعنت اور اسلامی نظام معیشت کی نقیض ہے۔ ان دونوں میں اس قدر تخالف ہے کہ قرآن نے ربوٰا کے کاروبار کو "خدا و رسول" کے خلاف اعلانِ جنگ سے تعبیر کیا ہے۔ چودھری صاحب نے اس کاروبار کو بند کرنے کے لئے جو تجاویز پیش کی ہیں وہ بیشتر قرآنی معیشت کے اصولوں پر مبنی ہیں۔ مثلاً یہ کہ کسی کے پاس اتنی زمین نہ ہو جسے وہ دوسروں کو بٹائی پر دے کر بغیر محنت کئے دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرے۔ اسی طرح تجارت میں بھی ایسا طریق اختیار کیا جائے کہ اس سے مقصد تیار شدہ اشیاء کا صارفین تک پہنچانا ہو۔ نفع اندوزی نہ ہو۔ مقصد یہ ہے کہ زائد از ضرورت دولت حاصل اور جمع کرنے کے راستوں کو بند کر دیا جائے۔ یہ ٹھیک ہے لیکن اس کے ساتھ ہی چودھری صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس کا صحیح طریق، نظامِ زکوٰۃ ہے اور زکوٰۃ سے ان کی مراد یہی "اڑھائی فیصد سالانہ" کی ادائیگی ہے۔ حیرت ہے کہ ایک طرف، مصنف زائد از ضرورت دولت جمع کرنے کے بھی خلاف ہے، اور دوسری طرف وہ زکوٰۃ کی ادائیگی پر بھی زور دیتا ہے۔ جب زائد از ضرورت دولت جمع ہی نہیں ہو گی تو معلوم زکوٰۃ دی کس روپے پر جائے گی؟

حقیقت یہ ہے کہ ربوٰا کا سوال بے حد اہم اور بنیادی ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ قرآن کریم اسے خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیتا ہے۔ اس نے "اسلامی مملکت" کے خلاف بغاوت کے علاوہ اور کس

جرم کو خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ نہیں کہا۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ ربٰوا اور اسلامی نظام متضاد چیزیں ہیں جو ایک جگہ اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ دوسری طرف اس وقت دنیا کا عام معاشی نظام ہے جس کوئی کام ربٰوا کے بغیر ہو ہی نہیں رہا۔ ان حالات میں ربٰوا کے مسئلہ پر بڑے ہی غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اصل یہ ہے کہ ربٰوا کا سوال صرف "سود" کا مسئلہ نہیں۔ اصل سوال قرآنی اور غیر قرآنی نظام ہائے معیشت کا ہے اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ پہلے پورے کا پورا قرآن کا معاشی نظام سمجھا جائے اور پھر یہ دیکھا جائے کہ موجودہ زمانے کے بین الاقوامی نظام معاشی کے مقابلہ میں قرآنی نظام کو کس طرح نافذ کیا جا سکتا ہے۔ جب تک یہ نہیں کیا جائے گا "سود" کا مسئلہ حل نہیں ہو سکے گا۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے یہ کوئی الگ مسئلہ نہیں۔ یہ ایک مکمل نظام معیشت کا سوال ہے۔ نظام معیشت کو الگ رکھ کر اس مسئلہ کے حل کی جس قدر کوششیں کی جائیں گی ناکام رہیں گی۔ طلوع اسلام میں قرآن کے معاشی نظام کے سلسلے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ یہ تو ہے ہی قرآنی نظام ربوبیت کا علمبردار۔

زیر تبصرہ پمفلٹ ادارہ معیشت اسلامی۔ جی/769 مری روڈ۔ راولپنڈی سے تین آنے میں مل سکتا ہے۔

دھتکارے ہوئے انسان

جیل کی سلاخوں کے پیچھے کیسے کیسے انسان قید و بند کے مراحل طے کر رہے ہیں۔ ان کے جرائم کا پس منظر کیا ہے اور ذمہ دار کون؟ ایک شریف خاندان کے لختِ جگر اور صاحب قلم صحافی عنایت اللہ نے ان مجرموں کی داستانیں اور دلوں کی دھڑکنیں قریب سے سنیں اور ان کا پورا پورا تجزیہ کیا۔ یہ کتاب ایک عبرت انگیز ناول بھی ہے۔ جیتے جاگتے حقائق کی دلچسپ تصویر بھی ہے۔ اور ہمارے معاشرہ پر ایک بھرپور طنز بھی۔ عنایت اللہ کے حقیقت کشا اور پُر سوز انداز نگارش نے اس کتاب کی قدر و قیمت نمایاں اضافہ کیا ہے۔ معاشرتی جرائم کے کئی اہم گوشے اور قومی معاشرے کی اصلاح کے کئی بنیادی تقاضے اس کتاب کے اوراق میں ابھر ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ **قیمت پانچ روپے**

ملنے کا پتہ: میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ، ۲۷ بی شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور۔

دائرۂ باہمی

بزمہائے طلوع اسلام کی ماہانہ رپورٹ

ڈھاکہ

۲۶ اکتوبر (اتوار) کو بزم کا اجلاس محترم نبی حسن صاحب کے دولتکدہ پر ہوا۔ کاروائی کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ جس کے بعد "مفہوم القرآن" سے اس کی وضاحت سامنے لائی گئی۔ اس کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ پرویز صاحب کے درس قرآن کے تازہ بتازہ ٹیپ مرکز سے حاصل کرنے کا خاطر خواہ انتظام کیا جائے۔ یہاں کے "پاک کتاب گھر" والوں نے جو کتب میزان پبلیکیشنز لاہور سے منگوائی تھیں ان میں سے اکثر بزم نے خرید کر لی ہیں۔ اور جو باقی بچیں وہ بھی ہاتھوں ہاتھ بک گئیں۔ اب مکتبہ مذکورہ میزان والوں سے مزید کتب کی فرمائش کر رہا ہے۔ ان کتابوں کی بدولت بزم کے زیر اہتمام ایک لائبریری کا قیام عمل میں آگیا ہے جس سے شائقین بڑا استفادہ حاصل کر رہے ہیں۔ "طلوع اسلام" کی ایجنسی کا قیام بھی زیر غور ہے۔ اور اس کے لئے اشتہارات حاصل کرنے کی کوشش بھی جاری ہے۔ مقامی اخبارات میں مضامین کی اشاعت بھی ہو رہی ہے۔ "حاصل مطالعہ" کا پروگرام بڑا مفید ثابت ہوا اور اس سلسلے میں پہلی ہی بار احباب نے جو اپنے تاثرات پیش کئے انہیں بے حد پسند کیا گیا۔ اجلاس میں احباب نے یہ بھی طے کیا کہ ایک دوسرے کی مشکلات میں سب مل کر رفاقت کا پورا پورا حق ادا کریں۔ ادارے سے اردو و انگریزی کے جو پمفلٹس حاصل کئے گئے تھے وہ یہاں کے مختلف اداروں اور لائبریریوں کو بھیجے جا رہے ہیں۔ ان پمفلٹس کو بنگلہ زبان میں شائع کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے۔ مشرقی پاکستان میں محترم پرویز صاحب اور ادارۂ طلوع اسلام کی مطبوعات اب "پاک کتاب گھر" ڈھاکہ کے پتہ پر حاصل کی جا سکتی ہیں۔

راولپنڈی

بزم کی رپورٹ کئی ماہ سے برائے اشاعت نہیں بھیجی جا سکی کیونکہ نمائندہ بزم محترم عزیز قریشی صاحب مری میں متعین تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں بھی بزم کی سرگرمیاں

جاری رہیں۔ پرویز صاحب کا درس قرآن (بذریعہ ٹیپ) باقاعدگی اور تسلسل سے سنایا جا رہا ہے۔ پمفلٹس کی تقسیم کے علاوہ "طاہرہ کے نام خطوط" کی جلدیں یہاں کی ممتاز خواتین تک پہنچائی گئی ہیں اور انہیں بے حد پسند کیا گیا ہے۔ نیشنل اسمبلی کے ارکان سے بھی رابطہ قائم رہا اور انہیں حسب ضرورت لٹریچر مہیا کیا جاتا رہا۔ قریشی صاحب اب راولپنڈی واپس آ گئے ہیں۔ اور ان کی آمد سے بزم کی سرگرمیاں تیز تر ہو گئی ہیں۔ اور کوشش کی جا رہی ہے کہ جمعہ کے درس قرآن کے علاوہ "جوائنٹ [illegible]" بھی ہوتا ہے۔ بہتر ہو گا کہ کسی دوسرے مقام پر بھی اس کا سلسلہ جاری ہو۔ اسلام آباد میں محترم محمد اسلم کہستانی نے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے اپنی جدوجہد کا آغاز کر دیا ہے۔

سرگودھا

نمائندہ بزم محترم ارشد محمود اور محترم حسن محمد نظامی پوری تندہی سے تحریک کے مقاصد کی اشاعت و تبلیغ میں سرگرم ہیں۔ پچھلے دنوں سید نصیر شاہ صاحب یہاں تشریف لائے تو نظامی صاحب اور دیگر احباب کی معیت میں انہوں نے شہر کے اہل علم اور صاحب ذوق حضرات سے ذاتی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہ سلسلہ بڑا مفید ثابت ہوا ہے۔ اور اس سے ان افترا پردازیوں اور غلط فہمیوں کا ازالہ ہو گیا ہے جو مخالفین آئے دن پھیلانے میں مصروف تھے۔

کوئٹہ

ہفتہ وار اجتماع باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ "ظلم کا مفہوم" کے موضوع پر پرویز صاحب کا درس قرآن بذریعہ ٹیپ سنایا گیا۔ لٹریچر کی تقسیم باقاعدگی سے جاری ہے اور اس سے اہل علم ان الزام تراشیوں کی حقیقت بخوبی سمجھ گئے ہیں جن کا پروپیگنڈہ قدامت پرست مذہبی طبقے کے لوگوں کی طرف سے آئے دن جاری رہتا ہے۔

بستی برمانی
(ضلع ڈیرہ غازی خان)

دیہات کی فضا میں قدامت پسندی کی شدید مخالفت کا سامنا کرتے ہوئے بزم پوری ہمت اور حوصلے سے اپنا فریضہ سرانجام دے رہی ہے۔ محترم حکیم خدا بخش اور نمائندہ بزم کی سرگرم مساعی نے اراکین بزم کے حوصلوں کو بلند کر رکھا ہے۔ ان حضرات کی اشاعت و تبلیغ سے بہت سے دیہاتی قرآنی فکر کی روشنی سے مستفید ہو رہے ہیں۔

بوریوالہ

بزم کے اجتماعات ہر ہفتہ باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ ان اجتماعات میں آج کل ساتویں پارے کا درس مفہوم القرآن شروع ہے۔ لٹریچر کی تقسیم اور تعلیم یافتہ حلقوں سے افہام و تفہیم کے ذریعہ رابطہ جاری ہے۔

لاہور چھاؤنی

بزم کے ایک مخلص رکن جناب مرزا محمد اسحاق صاحب مالک کوہ نور ٹیلرنگ کا ۱ اکتوبر کو انتقال ہو گیا۔ موصوف طلوع اسلام کے ابتدائی دور کے قارئین میں سے تھے۔ قرآن کریم سے انہیں عشق تھا۔ مرزا صاحب کے انتقال سے بزم ایک عزیز اور شفیق بزرگ سے محروم ہو گئی۔ احباب بزم تعزیت موصوف کے مکان پر گئے۔ خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ (ادارہ)

لاہور — بزم کی سرگرمیاں منظم طریق اور کامیابی سے جاری ہیں۔ ان سرگرمیوں کی بدولت پرویز صاحب کے درسِ قرآن کے اجتماعات میں حاضری بڑھ رہی ہے اور اہلِ علم و بصیرت حلقوں میں قرآنی فکر کی روشنی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ قوم کا زیرِ تعلیم نوجوان طبقہ بالخصوص قرآن کی دعوتِ انقلاب سے متاثر ہو کر اس کی طرف کھچا چلا آرہا ہے۔ اسی کے اس ذوق و شوق کا نتیجہ ہے کہ ابھی ابھی سمایوں کے طلباء پر مشتمل جو "اسٹڈی سرکل آف پاکستانی طلبہ" قائم ہوئی ہے اس کے زیرِ اہتمام وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں ۲۰ اکتوبر (اتوار) کی صبح کو جلسۂ عام کا انعقاد ہوا جس میں پرویز صاحب کو خطاب کی دعوت دی گئی۔ خطاب کا موضوع تھا۔۔۔۔

"ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں ؟"

یوں تو اس سے پہلے بھی اس ہال میں پرویز صاحب کی تقریر سننے کے لئے حاضرین کا بے پناہ ہجوم ہوتا تھا لیکن اس اجتماع میں تو نوجوان طلباء کی حاضری اور جذبۂ شوق دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ محترم صادق حیات ایم۔ اے، ایل ایل بی (فائنل) اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ کارروائی کا آغاز محترم عبدالوحید متعلم ایل ایل بی نے تلاوتِ کلامِ پاک سے کیا۔ وہ ہر آیت کے ساتھ اس کا مفہوم بھی بڑے اثر انگیز پیرائے میں بیان کرتے تھے ان کے بعد محترم محمد انور بی۔ اے ایل ایل بی لیڈ رنے کلامِ اقبالؒ سے وجد کی سی کیفیت طاری کر دی۔ ان کے بعد صدرِ اجلاس نے اپنے مختصر تعارفی خطاب میں اجلاس کے فاضل مقرر محترم پرویز صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کی گرانقدر شخصیت کو حاضرین سے متعارف کرایا اور قرآنی فکر کے سلسلے میں پرویز صاحب کی سالہا سال کی بصیرت افروز کاوشوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اس پر اظہارِ مسرت کیا کہ بعض مفاد پرست عناصر کی خود غرضانہ مخالفت کے باوجود انہیں علم و بصیرت کی بارگاہ میں قدر و احترام کا بلند مقام حاصل ہے۔ صدرِ اجلاس نے اس خطاب میں پرویز صاحب کی جلیل القدر خدمات کو سراہتے ہوئے اس یقین کا اظہار کیا کہ انہوں نے قرآنی فکر کی جو روشنی مہیا کی ہے آنے والی نسلیں اس کے لئے ان کی ممنونِ احسان رہیں گی۔ انہوں نے مزید کہا کہ قومی زندگی کے تپتے ہوئے صحرا میں یہ عظیم مفکرِ قرآن ایک سرسبز و شاداب نخلستان کی حیثیت رکھتا ہے اور کشمکشِ حیات کے تلاطم میں ان کا مقام اس روشنی کے مینار کا سا ہے جس کی روشنی ڈوبتے ہوئے سفینوں کو ساحلِ مراد کا سراغ دے رہی ہو۔ انہوں نے مزید کہا کہ اس وقت جبکہ نئی نسل کی بے راہ روی اور اخلاقی زوال کا رونا رویا جا رہا ہے۔ اور کوئی بھی اس کے محرکات کا تجزیہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہم اس موضوع پر ایک ایسے مفکر کا خطاب سن رہے ہیں جس نے انتہائی محبت اور شفقت سے نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکنوں کو سنا ہے اور قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک ان کی مشکلات اور مسائل پر خلوص بھری توجہ مبذول کئے ہوئے ہیں۔

اس تعارف کے بعد پرویز صاحب خطاب کے لئے حاضرین کے سامنے آئے۔ وہاں اجلاس کے ہر گوشے سے ملت کے شاہین

بچوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ اور ہال سے باہر شامیانوں کے سامنے بھی تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ ذوق وشوق کی سرمستیوں سے بھرپور فضا میں کیریکٹر کے اہم موضوع پر مفکر قرآن کا خطاب شروع ہوا۔ ملتِ پاک کے مقدر کے ابھرتے ہوئے ستاروں کا ہجوم ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ یہی ستارے تھے جو سالہا سال سے ان کی حسین ترین آرزوؤں کا محور بنے آ رہے تھے۔ پرویز صاحب کا قلب و نگاہ ایک والہانہ کیف میں رہا تھا۔ اور ان کے مخصوص لب و لہجے میں سوز و ساز کی وہ موجیں ابھر رہی تھیں جنہوں نے چند ہی لمحوں میں وجد و کیف کا سماں باندھ دیا۔ ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں رہا؟ کیریکٹر کا مفہوم کیا ہے؟ کیریکٹر کی تعمیر کیونکر ممکن ہے؟ اس میں خرابی کیونکر پیدا ہوتی ہے؟ کن اقدارِ حیات کی آغوش میں افراد و اقوام کے کیریکٹر کی نشوونما ممکن ہے۔ اور ان اقدار سے روگردانی اختیار کرکے انسانی زندگی کیوں کر حیوانی سطح اختیار کر لیتی ہے؟ پرویز صاحب کا علم افروز خطاب انہی اہم سوالات کا نکھرا ہوا جواب تھا۔

محترم پرویز صاحب دورانِ خطاب میں ملت کے ان شاہین بچوں کے والہانہ ذوق و شوق کی تحریریں ان کے چہروں سے پڑھ رہے تھے۔ اور اس قدر متاثر تھے کہ خطاب کے اختتام پر موصوف نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں اور تھرتھراتی ہوئی پرسوز آواز میں ان کے لیے یہ دعا مانگی کہ

> میرے عزیزو! تم جبینِ پاکستان پر کہکشاں بن کر چمکو اور تمہاری ضوفشانیوں سے بھولے بھٹکے راہی نشانِ منزل پالیں۔

الفتنة الکبریٰ

حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافتؓ کس فتنۂ عظیم کا دروازہ کھل گیا۔ اس کی غیر جانبدارانہ اور مکمل تفصیل آپ کو مصر کے مشہور عالم اور مؤرخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی شہرۂ آفاق کتاب الفتنۃ الکبریٰ میں ملیگی۔ یہ کتاب ادارہ طلوعِ اسلام کے زیرِ اہتمام اردو میں شائع ہے اور پروفیسر محمد منور صاحب ایم۔ اے کا سلیس و شگفتہ ترجمہ اس کی افادیت کو چار چاند لگا رہا ہے۔ قیمت چھ روپے۔

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ
۲۷۔ بی شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

بچوں کا صفحہ

گواہی

میر ناصر اور میر نادر دو بھائی تھے۔ بڑے اچھے اور بڑے پیارے۔ ان کے والد میر سرفراز کہیں کام نہ کرتے تھے۔ اُن کی بہت خاصی جائیداد تھی۔ کئی مکان اور کئی دکانیں۔ ان کا کرایہ آتا اور یہ لوگ مزے سے زندگی بسر کرتے۔ مگر بھئی تم جانو کہ ایسے لوگ جو محنت مشقت نہیں کرتے۔ دوسروں کی کمائی یا باپ دادا کی جائداد پر گزر بسر کرتے ہیں، بُرے کاہل ہو جاتے ہیں۔

میر ناصر نے تو شوق سے تعلیم حاصل کی۔ مگر میر نادر کو پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بچے تھے تو ہر وقت پتنگ اڑایا کرتے، کنڈی کھیلتے، لٹو نچاتے اور بڑے ہوئے تو دوستوں کے ساتھ کبھی مچھلی کے شکار پر جا رہے ہیں، کبھی سینما کا پروگرام بن رہا ہے اور کبھی دو چار دن کے لئے پکنک پر نکل گئے۔

ایک دن اُن کے والد میر سرفراز کا انتقال ہو گیا۔ میر ناصر اور میر نادر دونوں جوان تھے۔ جب جائیداد ان کے درمیان بانٹی گئی تو کچھ باتوں پر جھگڑا ہوا اور دونوں کے دل ایک دوسرے کی طرف سے میلے ہو گئے۔

ان کی جائیداد میں ایک باغ بھی تھا۔ اس کا بھی بٹوارہ ہوگیا۔ امرود اور جامن کے پیڑ میر ناصر کے حصے میں آئے اور آم کے پیڑ میر نادر کے حصے میں۔ آموں کی فصل تھی۔ ایک دن میر ناصر اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ باغ میں پہنچے اور میر نادر کے درختوں سے سب لوگ آم توڑ توڑ کر کھانے لگے۔

اتفاق کی بات میر نادر بھی اپنے دوستوں، مالیوں، اور نوکروں کے ساتھ آنکلے۔ پھر کچھ نہ پوچھو کہ کیسی تو تو میں میں ہوئی۔ بات جھگڑے تک پہنچی۔ آپس میں لاٹھیاں چل گئیں۔ میر ناصر پولیس اسٹیشن پہنچے اور وہاں جھوٹی رپورٹ لکھوادی کہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ جامن اور امرود کے باغ میں بیٹھا تھا کہ میرے بھائی نے آکر اچانک حملہ کردیا اور بہت مار پیٹ کی۔ رپورٹ لکھ لی گئی اور عدالت میں مقدمہ شروع ہوگیا۔ دونوں نے بہت سے جھوٹے گواہ تیار کرلئے جو قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر جھوٹی گواہیاں دینے لگے۔

ایک صبح جب میر ناصر مقدمہ کی پیشی کے لئے عدالت جانے والے تھے تو برکت کے لئے اور مقدمہ جیتنے کی دعا کرنے کے لئے قرآن شریف کھول کر بیٹھ گئے۔ اتفاق دیکھو کہ قرآن شریف کی یہ آیت ان کے سامنے آگئی جس میں اللہ میاں نے کہا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ

(اے ایمان والو! تم ہمیشہ انصاف پر قائم رہو۔ اور اللہ کے لئے سچی گواہی دو خواہ اس میں تمہارا۔ تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کا نقصان ہی کیوں نہ ہو)

یہ پڑھنا تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ سوچنے لگے کہ توبہ توبہ! میں نے اس مقدمہ کے سلسلے میں کتنے جھوٹ بولے

ہیں۔ جب عدالت پہنچے تو انہوں نے جج صاحب سے کہا کہ "جناب والا! میں یہ مقدمہ واپس لینا چاہتا ہوں اور اپنے بھائی سے صلح صفائی کرنے کے لئے تیار ہوں"۔ عدالت فوج داری (کریمنل) کے مقدموں میں صلح کرانے کے لئے تیار رہتی ہے انصاف کا ایک مقصد یہ بھی ہے۔ جج صاحب نے کہا کہ "میں آپ کی بات مانے لیتا ہوں۔ مگر یہ بتائیے کہ آپ نے یہ فیصلہ کیوں کیا؟" میر ناصر نے جج صاحب کو پوری بات بتا دی اور کہا کہ قرآن شریف کی ایک آیت نے آج سے میری پوری زندگی بدل دی ہے۔ جج صاحب بہت خوش ہوئے اور بولے کہ آپ کی سچائی کی وجہ سے آپ کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے گی۔ ورنہ عدالت کو دھوکہ دینے کی کوشش اور جھوٹی گواہیاں پیش کرنا جرم ہے"۔

میر ناصر عدالت سے نکلے تو میر نادر آکر ان کے گلے سے لپٹ گئے اور کہنے لگے کہ "بھائی جان! سارا باغ آپ کا ہے"۔

دونوں بھائی ایک بار پھر پیار محبت سے رہنے لگے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ باغ اور جائیداد کو بیچ دیا جائے تاکہ آئندہ ان کے بچوں میں لڑائیاں نہ ہوں۔ اور کہیں وہ بھی کاہل نہ بن جائیں۔ جائیداد بیچ کر دونوں نے تجارت شروع کی اور اس طرح کہ سارا شہر ان کی ایمانداری کی قسمیں کھاتا تھا۔ (بھائی جان)

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گزشتہ روز و شب

اقبالؒ

(قسط ۱۱)

اِحتسَاب

[طلوع اسلام کے گزشتہ اگست کے شمارہ تک "احتساب" کا سلسلہ دس قسطوں تک بڑھ چکا تھا۔ اب گیارہویں قسط قارئین کے سامنے ہے اور یہ اس دور سے متعلق ہے جب صدر محمد ایوب خان نے مارشل لاء کے نفاذ کے ذریعہ ملک کو تباہی کے جہنم سے بچا کر قومی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز کیا تھا۔ اور ہمارے لئے یہ انتہائی مسرت کا مرحلہ تھا کہ صدر مملکت وہی قرآنی تصورات لئے عوام کے سامنے آئے جن کی دعوت مسلسل بیس برس سے طلوع اسلام کی طرف سے پیش کی جا رہی تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ قرآنی انقلاب کے عظیم مقاصد کے یہ ہم آہنگی ہمارے لئے شادابیٔ قلب و نگاہ کا سامان تھی، اس لئے اس پر کسی تنقید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ "ہر وہ آواز جو قرآنی مقاصد کے موافق ہو، خواہ وہ کسی گوشے سے اٹھے اس کی حمایت۔ اور جو اس کے برخلاف ہو اس کی مخالفت" یہ ہے طلوع اسلام کا مسلک، جو شروع سے اسی طرح چلا آ رہا ہے۔ وہ "تنقید برائے تنقید" کا یہ قائل ہی نہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ طلوع اسلام اپنے فریضۂ احتساب سے غافل ہو گیا تھا۔ اس نے جس مقام پر دیکھا کہ گاڑی صحیح پٹڑی سے اتر رہی ہے، وہیں ارباب اقتدار کو اس سے متنبہ کر دیا اگرچہ اس تنبیہ کا انداز ایسا تھا جیسا ایک ہم سفر رفیق راہ کے کسی سہو پر اسے ٹوکا جاتا ہے۔ صدر محترم، مختلف مقامات پر اپنی تقاریر اور بیانات سے جن مقاصد کو اپنا مطمح نگاہ بتاتے تھے، وہ اس امر کی شہادت دیتے تھے کہ ان کی منزل وہی ہے جس کی نشاندہی طلوع اسلام ایک عرصہ سے کرتا چلا آ رہا تھا]۔

تعلیمی اصلاحات کی اہمیت

اب ہم ۱۹۵۸ء سے آگے بڑھ آتے ہیں اور جنوری ۱۹۵۹ء کا طلوعِ اسلام ہمارے سامنے ہے۔ ۱۲ دسمبر ۱۹۵۸ء کو صدرِ مملکت کی طرف سے تعلیمی کمیشن کے تقرر کا اعلان ہو چکا تھا۔ مملکتِ پاکستان جن ارفع و اعلیٰ مقاصد کے لئے معرضِ وجود میں آئی تھی ان کا حصول نئی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت پر منحصر تھا۔ اس لئے قومی تعلیمات کا مسئلہ بنیادی اہمیت کا حامل تھا۔ طلوعِ اسلام نے گزشتہ گیارہ بارہ سالوں میں بار بار قوم کو اس اہمیت کا احساس دلایا تھا اور جونہی تعلیمی کمیشن کے تقرر کا اعلان ہوا اس نے پوری وضاحت سے تعلیمی مقاصد کی نقاب کشائی کا حق ادا کیا۔ سب سے پہلے اس نے کمیشن کے حدودِ تحقیق و سفارشات کی سرکاری تفصیل پیش کی اور اس کے بعد لکھا۔

ان تفاصیل سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہوگی کہ اس کمیشن کا تعلق زیادہ تر تعلیمی اداروں کے نظم و نسق، قواعد و ضوابط اور طرق و اسالیبِ تعلیم سے ہے۔ تعلیم کی غایت و مقصد اور منتہیٰ و مطلوب سے نہیں۔ یعنی یہ کمیشن اس انداز کا ہے جس انداز کا (جدید) قانونی کمیشن ہے، جس کے پیشِ نظر عدالتوں کے طریقِ کار کی تحقیق و اصلاح ہے نہ کہ قوانین میں تغیر و تبدل۔ اس میں شبہ نہیں کہ جس مقصد کے لئے اس کمیشن کا تقرر ہوا ہے وہ بھی اپنی جگہ اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جس کمیشن کے حدودِ تحقیق و سفارشات وہ ہوں، جن کی تفصیل اوپر درج ہے وہ کمیشن اس مقصد کو پورا نہیں کر سکتا جو ہمارے پیشِ نظر ہے۔ (لمعات شمارہ جنوری ۱۹۵۹ء۔ صفحہ ۳)

اس کے بعد طلوعِ اسلام ہماری قومی تعلیمات کے مقاصد کو حسبِ ذیل الفاظ میں سامنے لاتا ہے۔

ہماری تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اس زندگی کا تصور جس کے لئے پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے صاف اور واضح طور پر ذہن نشین ہو جائے اور اس کی صداقت و محکمیت کا یقین دل میں راسخ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ وہ نہج زندگی اور فلسفۂ حیات اس کے سوا اور کون سا ہو سکتا ہے جسے خدا نے ہمارے لئے متعین کیا ہے اسی کو اسلام یا الدین کہتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اس کے لئے واضح طور پر معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلام (یا دین) کیا ہے۔ اس کے تقاضے کیا ہیں۔ اس کا مقصود و مطلوب کیا ہے۔ وہ کس قسم کے انسان پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ان انسانوں کا نصب العین کیا ہوگا اور ان کی سیرت و کردار کس قسم کا۔ یہ انسان کس قسم کا معاشرہ قائم کریں گے۔ اس معاشرہ کے نتائج خود اپنی مملکت کے لئے کیا ہوں گے اور باقی انسانیت کے لئے کیا۔ (وغیرہ وغیرہ) اسی کا نام اسلامی تعلیم ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ تعلیم نہ تو وہ ہوگی جو اس وقت "اسلامیات" کے نام سے ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے اور نہ ہی وہ جس کا ماحصل ہمارے علماء ہوتے ہیں۔ ... (ایضاً)

آگے چل کر اس نے حسب ذیل الفاظ میں مزید وضاحت کی۔

ہمارے ہاں تعلیم کے سلسلے میں سب سے پہلا قدم اٹھانے کا یہ ہے کہ "مذہبی اور دنیاوی تعلیم" کی اس ثنویت کو ختم کر دیا جائے۔ جب ہمارے ہاں دین اور دنیا میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں تو مذہبی اور دنیاوی تعلیم الگ الگ درسگاہوں میں کیوں دی جائے۔ ایک ہی درسگاہ میں عصر حاضر کے جملہ علوم کے ساتھ دین کی تعلیم دی جانی چاہیئے۔ (ایضاً۔ ص۷)

طلوع اسلام نے اس دینی تعلیم کو غیر اسلامی تصورات سے پاک کرنے پر بھی زور دیا اور لکھا۔

یہ حقیقت ہے کہ وہی فرد، ادارہ یا مملکت، مسلمانوں کی حقیقی بہی خواہ اور نوع انسانی کی محسن ہوگی جو اسلام کو غیر اسلامی تصورات و نظریات کی زنجیروں سے آزاد کر کے اسے اپنی منزل تک پہنچنے کا موقع مہیا کریگی۔ لیکن یہ کام اس کے ہاتھوں سرانجام پائے گا جو تعصب اور جہالت کی ہر یورش کا مقابلہ کرنے کی ہمت اور جرأت رکھتا ہو۔۔۔ اسلام کو ان غیر اسلامی زنجیروں سے آزاد کرانا کسی محکوم ملک کو غیروں کے تسلط سے آزاد کرانے سے بھی زیادہ مشکل اور ہمت طلب مرحلہ ہے۔ لیکن اس کے بغیر ملک میں کوئی صحیح اور پائیدار تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ (ایضاً۔ ص۵)

نئے آئین کی ترتیب و تدوین

مارشل لاء کے نفاذ کے بعد اب آہستہ آہستہ نئے آئین کی ترتیب و تدوین کا اہم مسئلہ ملک کے سامنے ابھر کر آ رہا تھا۔ صدر مملکت اور وزیر خارجہ (محترم منظور قادر) کے وضاحتی اعلانات منظر عام پر آ چکے تھے اور اپنی اہمیت کی بنا پر اب یہ مسئلہ ملک کے ہر اہل فکر حلقہ میں زیر بحث آ رہا تھا۔ طلوع اسلام جس کی ساری کد و کاوش اور فکری و نظری جنگ اسی مسئلہ پر مرکوز تھی وہ کیونکر اس معاملہ میں خاموشی اختیار کرتا۔ چنانچہ اپریل ۱۹۶۳ء کے شذرات میں اس نے اس مسئلہ پر سیر حاصل تبصرہ کیا اور آخر میں لکھا۔

آئین کا معاملہ بچوں کا کھیل نہیں۔ اس کا تعلق قوم کی پوری زندگی اور آنے والی نسلوں کے مستقبل سے ہے۔ نہ ہی یہ مذہبی مناظرہ ہے کہ اس میں لفظی گورکھ دھندوں سے اپنے متبعین کو خوش کر لیا جائے، یہ ایک ٹھوس تجربہ ہے جسے (تیرہ سو سال کے بعد) پہلی مرتبہ عمل میں لایا جا رہا ہے اور جس کی طرف ساری دنیا کی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ اگر یہ تجربہ کامیاب ہو گیا تو دنیا اس نتیجہ پر پہنچے گی کہ اسلام ایک عملی العمل ضابطۂ زندگی ہے جو آج بھی اپنے نتائج مرتب کر سکتا ہے۔ اگر یہ ناکام رہا تو (دنیا ہمارے متعلق جو رائے قائم کرے سو کرے) خود اسلام کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ یہ کسی دور میں تو قابل عمل تھا، لیکن اب اس میں یہ صلاحیت نہیں کہ یہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔

اندریں حالت یہ مسئلہ سطحی جذبات کی رو سے طے کرنے کا نہیں، کامل غور و فکر اور متانت و سنجیدگی سے حل کرنے کا ہے۔ (لمعات۔ شمارہ اپریل ۱۹۵۹ء۔ ص۵)

نیا دارالحکومت اور سرمایہ دارانہ اثرات

۱۲ جون ۱۹۵۹ء کو حکومت پاکستان نے دارالحکومت کو کراچی سے راولپنڈی کے مضافات (اسلام آباد) میں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نئے دارالحکومت کی تعمیر قومی مستقبل سے گہرا تعلق رکھتی تھی اور یہ اشد ضروری تھا کہ اس سلسلے میں بعض اہم احتیاطی تدابیر شروع سے ہی ملحوظ رکھی جائیں۔ چنانچہ طلوع اسلام نے اپنے لمعات میں اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا۔

> سب سے پہلی ضرورت اس امر کی ہے کہ نئے دارالحکومت کو بڑے بڑے سرمایہ داروں کے ان اثرات سے محفوظ رکھنے کی سبیل پیدا کی جائے۔ جو کراچی میں مرکزی حکومت کے دفتری نظام پر تسمہ پا بیل کی طرح مسلط ہو چکے ہیں۔ ابھی ابھی خفیہ دولت کے اظہار کے سلسلے میں جو اعداد و شمار عوام کے سامنے آئے ہیں وہ واضح کر رہے ہیں کہ اس شہر میں آباد لکھ پتیوں اور کروڑ پتیوں کی تعداد سینکڑوں بلکہ ہزاروں تک پہنچتی ہے اور مرکز کے دفتری نظام کا کوئی بڑے سے بڑا عہدہ دار بھی دو تین ہزار سے زیادہ مشاہرہ وصول نہیں کرتا۔ ایسی صورت میں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ جس شہر میں اتنے بڑے سرمایہ داروں کی تعداد دفتری نظام کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہو، وہاں مملکت کے نظام میں رشوت ستانی، احباب پروری، طلب منفعت، بے انصافی اور دھاندلی کا کس قدر ہولناک سلسلہ برپا ہو گا۔ اور دفتری نظام کی حالت کس قدر دگرگوں ہو گی۔ اس تلخ تجربے کی موجودگی میں یہ اشد ضروری ہو گا کہ نئے دارالحکومت میں بڑے بڑے صنعتی اور کاروباری عناصر کو آباد ہونے کا موقع نہ دیا جائے اور ہر وہ صورت اختیار کی جائے جس کی بدولت مرکزی سیکرٹریٹ ان عناصر کے اثرات سے کلیتہً محفوظ رہ سکے۔
>
> دوسری اہم ضرورت اس سلسلے میں یہ ہے کہ نئے دارالحکومت میں بڑے بڑے محلات تعمیر کرنے کی اجازت قطعاً نہ دی جائے۔ کراچی میں ایک ایک بنگلے پر لاکھوں روپے صرف ہوئے اور اس طرح بہت سی قومی دولت، مفید کاموں میں استعمال ہونے کی بجائے ان اینٹوں اور پتھروں میں منجمد ہو کر رہ گئی جو بڑے بڑے سرمایہ دار اپنے عشرت کدوں کی تعمیر میں لگا گئے۔ (شمارہ جولائی ۵۹ء صفحہ ۳)

آئین کا مسئلہ

نئے آئین کی ترتیب و تدوین کا مسئلہ اب دن بدن قومی زندگی میں ابھرتا چلا آ رہا تھا۔ مختلف گوشوں سے مختلف آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ مختلف مکاتیب فکر یہ

—— اپنے نقطۂ نظر سے اس موضوع پر اظہارِ خیال کر رہے تھے۔ طلوعِ اسلام نے اس مسئلہ پر ہمیشہ اپنی متعین اور دوٹوک رائے پیش کی تھی۔ چنانچہ اب پھر اس نے اپنے شمارہ اکتوبر میں اس پر ایک مبسوط مقالۂ افتتاحیہ لکھا اور تمام گوشوں پر شرح و بسط سے بحث کی۔ اس نے لکھا۔

> ہماری ساری تاریخ میں (قرونِ اولیٰ کے بعد) پاکستان پہلی مملکت تھی جس نے اسلامی مملکت بننے کا دعویٰ کیا۔ لیکن ہماری سابقہ مجلسِ دستور ساز نے جس قسم کا آئین مرتب کیا اسے اسلامی دستور سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ للہ الحمد کہ وہ دستور کالعدم قرار پا گیا۔ اب از سرِ نو آئین کی تدوین کا سوال زیرِ غور ہے۔ یعنی پھر مملکتِ پاکستان کی فکر و بصیرت کا امتحان ہے کہ وہ ایسا آئین مرتب کرتی ہے یا نہیں جسے صحیح معنوں میں اسلامی کہا جا سکے۔ ... اس ضمن میں سوال صحیح قرآنی بصیرت کا ہے اگر وہ انہیں میسر آ گئی تو اسلامی آئین بن جائے گا —— خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔
>
> (لمعات شمارہ اکتوبر ۱۹۵۹ء صـ۳)

یہ کچھ پیش کرنے کے بعد اس نے نیا آئین مرتب کرنے والوں کو اسلامی آئین کی اصولی خصوصیات پر متوجہ کیا اور اسی سلسلے میں یہ اہم حقیقت یاد دلائی کہ۔

> اسلامی نظام اپنے اصولوں کے اعتبار سے یکسر منفرد اور بے مثل و بے نظیر ہے اس لئے اس میں نہ کسی اور نظام سے مصالحت (COMPROMISE) کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ مختلف نظاموں کے امتزاج سے ایک نئے نظام کی تخلیق کا تصور۔ اس قسم کی مصالحت یا اشتراک کو قرآن شرک سے تعبیر کرتا ہے جو عدالتِ خداوندی میں ناقابلِ معافی جرم ہے۔ وہ اس کی اجازت تو دیتا ہے کہ کوئی قوم، اسلامی نظام سے انکار کر کے کوئی دوسرا نظام تجویز کرے۔ (وہ اسے کفر سے تعبیر کرتا ہے)۔ لیکن اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ ایک قوم اسلامی نظام کے حامل ہونے کا دعویٰ کرے اور اپنے ہاں خالص قرآنی نظام کی جگہ ایسا نظام رائج کرے جس میں بعض اجزا قرآنی ہوں اور بعض غیر قرآنی۔ یا جس میں کسی قرآنی اصول میں لچک پیدا کر کے کسی غیر قرآنی نظام سے مصالحت کی شکل پیدا کر لی جائے۔ (ایضاً صـ۷)

آئین کمیشن کے ارکان

رفتہ رفتہ آئین کمیشن کے تقرر کا مرحلہ قریب آ رہا تھا۔ کمیشن کے ارکان کی اہمیت اس سلسلے میں واضح ہے اور ان کی ذاتی فکر و بصیرت کی بھی۔ صدرِ مملکت نے مختلف مواقع پر دستورِ مملکت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا وہ بڑے امید افزا اور حقیقت کشا تھے۔ سوال یہ تھا کہ آیا کمیشن کے ارکان بھی نئے دستور کی تدوین میں ان خیالات سے کام لے سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں طلوعِ اسلام

نے شمارہ نومبر میں پہلے صدر کے ان خیالات کو تفصیلاً پیش کیا اور پھر لکھا ــــ

ظاہر ہے کہ یہ خیالات ایک زندہ پیکر اسی صورت میں اختیار کر سکتے ہیں جب مملکت کا آئین ان خطوط پر مرتب ہو۔ صدر مملکت کی ایک حالیہ تقریر کے مطابق ایک دو ماہ میں آئین کمیشن کا تقرر عمل میں آجائے گا۔ ظاہر ہے کہ آئین کے ممکن العمل کامیاب اور اسلامی ہونے کا دارومدار اس پر ہے کہ آئینی سفارشات مجوّز کرنے کا فریضہ جن حضرات کے سپرد کیا جائے گا ان کے خیالات کس قسم کے ہیں۔ صدر مملکت کے جو خیالات گزشتہ صفحات میں سامنے آچکے ہیں ان کی روشنی میں توقع کی جا سکتی ہے کہ آئین کمیشن کی ترتیب کے سلسلے میں یہ بنیادی حقیقت ان کے پیش نظر ہوگی کہ یہ کمیشن ان ارکان پر مشتمل ہونا چاہیئے۔

(۱) جو اسلامی آئیڈیالوجی ــــ قرآن کریم کے ابدی حقائق اور مستقل اقدار کی صداقت پر یقینِ محکم رکھتے ہوں۔

(۲) جو قرآن کریم کو نوعِ انسانی کے لئے واحد مکمل اور آخری ضابطہ سمجھتے ہوں اور اسی کی بنیادوں پر پاکستان کیلئے آئین مرتب کرنے کا جذبہ اپنے دل میں رکھتے ہو۔

(۳) جو اپنے اندر اتنی جرأت رکھتے ہوں کہ جو تصور، نظریہ، عقیدہ یا نظام قرآن کریم کے خلاف ہو، اسے بے باکانہ مسترد کر دیں۔ خواہ وہ مغرب کے "دانشکدوں" کے آئے یا اس پر ہمارے قدامت پرست طبقہ کی مہرِ تصدیق ثبت ہو۔

(۴) پاکستان کے بنیادی تصور اور مملکت پاکستان کے ساتھ جن کی وفاشعاری ہر قسم کے شکوک و شبہات سے بلند ہو۔

اگر آئین کمیشن اس قسم کے ارکان پر مشتمل ہو گیا تو پاکستان کو ایک ایسا آئین مل جائے گا جو نہ صرف ملتِ پاکستانیہ کو کامیابیوں اور کامرانیوں کی طرف لے جائے بلکہ نوعِ انسان جن مشکلات میں مبتلا ہے ان کے حل کیلئے بھی دلیلِ راہ بن جائے۔ (لمعات شمارہ نومبر ۱۹۵۹ء صفحہ ۱۲)

قرآن کا تصورِ جمہوریت

دسمبر ۱۹۵۹ء میں صدر مملکت محمد ایوب خان نے ملک کے عوام کو جمہوریت کے زیرِ ترتیب خدوخال اور نقشوں سے متعارف کرانے کے لئے ایک اسپیشل ٹرین (پاک جمہوریت) کے ذریعے مغربی پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کا طوفانی دورہ کیا اور ہر جگہ اس امر کی وضاحت کی کہ برطانوی طرز کی پارلیمانی جمہوریت کی ناکامی کے بعد آئندہ کے لئے کس قسم کی جمہوریت کا تجربہ ان کے زیرِ غور ہے۔ جنوری ۱۹۶۰ء کے لمعات میں طلوعِ اسلام نے صدر پاکستان کی ان تقاریر پر، جو انہوں نے جگہ جگہ اپنے

دوسرے ارشاد فرمائیں، بھرپور تبصرہ کیا۔ اس تبصرہ میں اس نے صدرِ مملکت کے ارشادات کو قرآنِ حکیم کی میزان میں تولا اور جسے اس کے عطا فرمودہ تصورات کے مطابق پایا اس کا خیرمقدم کیا اور جہاں دیکھا کہ اس سے غلط راہوں کی طرف قدم اُٹھ سکتے ہیں وہاں خامیوں کی نشاندہی کی۔ اس ساری بحث میں بنیادی مسئلہ جمہوری اساس (ڈیماکریسی جمہوریت) کا تھا۔ چنانچہ اس پر علیٰ وجہ البصیرت اپنی رائے پیش کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا۔

> "مغربی جمہوریت کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ ملک میں اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREIGNTY) عوام کو حاصل ہوتا ہے۔ عوام اپنے اس اقتدار کو اپنے نمائندگان کے ذریعہ بروئے کار لاتے ہیں۔ اور جو فیصلہ عوام کے نمائندگان کی اکثریت کرے وہ ملک کا قانون قرار پا جاتا ہے جس کی اطاعت ہر ایک کے لئے لازمی ہوتی ہے۔" اقتدارِ اعلیٰ کے معنی یہ ہیں کہ اس کے اختیارات سے بالا کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ وہ جو جی میں آئے فیصلہ کرے۔ اور جس قسم کا چاہے قانون وضع کرے۔
>
> یہ تصور قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ قرآن کی رو سے اس قسم کا اقتدارِ اعلیٰ کسی انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ کچھ بنیادی اصول اور مستقل اقدار عطا کی ہیں۔ جو قرآن میں محفوظ ہیں۔ ان اصول و اقدار میں کوئی فرد، کوئی ادارہ، کوئی حکومت کوئی مملکت کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کر سکتی۔ مملکتِ اسلامی ان اصول و اقدار کو برقرار رکھنے اور انہیں عملاً نافذ کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے۔ اس مملکت کو البتہ اس کا اختیار ہوتا ہے کہ ان غیر متبدل اصول کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے لئے جزئی قوانین مرتب کرے۔ یہ قوانین امت کے باہمی مشورے سے مرتب کئے جاتے ہیں۔ باہمی مشاورت کا اصول بھی قرآن کا مقرر کردہ اور غیر متبدل ہے۔
>
> (طلوعِ اسلام بابت جنوری سنہ ۱۹۶۰ء۔ ص ۱۷)

اسلامی آئیڈیالوجی کی اہمیت

اپنے اس دور میں صدرِ مملکت نے یہ بھی ایک مقام پر کہا تھا کہ ہمارے معاشرتی نظام میں ہر شخص کو وہ عزت اور آزادی حاصل ہوگی جس کا وہ حقدار ہے۔ بات تکریمِ انسانیت کے قرآنی نکتہ کی حد تک درست تھی۔ لیکن جہاں مملکت کی ذمہ داریوں کا مرحلہ آتا ہے وہاں اس سے ایک اشکال پیدا ہوتا ہے جس کی وضاحت ضروری سمجھتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا۔

> اسلامی مملکت کی مجلسِ قوانین سازی کا فریضہ یہ ہے کہ وہ قرآنی اصولوں کی حدود کے اندر مملکت کے تقاضوں کے مطابق قوانین وضع کرے۔ اب ظاہر ہے کہ جو لوگ (یعنی غیر مسلم) قرآنی اصولوں کی صداقت کے قائل ہی نہ ہوں انہیں ان اصولوں کے مطابق قوانین سازی کے کام میں شریک کرنا قرآنی اصولوں کا مضحکہ اڑانا اور خود ان لوگوں کا منہ چڑانا ہے جو ان اصولوں کو مانتے ہیں۔۔۔۔ ہمیں امید ہے کہ زیرِ تجویز کانسٹی ٹیوشن

اس مسئلہ کو کماحقہٗ اہمیت دیگا اور اپنی سفارشات میں اس امر کی وضاحت کر دے گا کہ پاکستان کا آئین اسلامی آئیڈیالوجی پر مبنی ہے۔ اس لئے جو لوگ اس آئیڈیالوجی کو نہیں مانتے وہ ان لوگوں کے ساتھ اصولی امور میں کس طرح شرکت کر سکتے ہیں جو اس آئیڈیالوجی کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں۔

(ایضاً۔ صـ۸)

آگے چل کر اس نے مزید وضاحت کی اور لکھا ـــــ

اسلامی نظام ایک مخصوص آئیڈیالوجی کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس میں ہر شخص کو اس کی اجازت ہوتی ہے کہ وہ اس آئیڈیالوجی کو اختیار کرے یا اس سے انکار کر دے۔ اب جو شخص برضا و رغبت، اس آئیڈیالوجی سے انکار کر دے، اس کے سپرد وہ کام کس طرح کئے جا سکتے ہیں جو اس آئیڈیالوجی کو بروئے کار لانے کا ذریعہ ہیں۔ یہ کام لامحالہ انہی کے سپرد کئے جا سکیں گے جو اس آئیڈیالوجی کو صحیح مانتے ہیں۔ (ایضاً۔ صـ۹)

کمیونزم کی روک تھام

صدرِ مملکت نے اپنی تقاریر میں کمیونزم کے خطرے کو روکنے کے لئے اسلامی آئیڈیالوجی کی عام نشر و اشاعت پر زور دیا تھا۔ طلوعِ اسلام کے نزدیک محض اتنا کر لینے سے یہ بات نہیں بنتی بلکہ بہت کچھ اور بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے لکھا۔

کمیونزم کی روک تھام صرف اسی صورت میں ہو سکے گی جب قرآنی نظامِ ربوبیت یہاں عملاً نافذ ہو جائے۔ اس نظام کی رُو سے، مملکت اس بات کا ذمہ لیتی ہے کہ وہ افرادِ مملکت کو بنیادی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچائے گی۔ لہٰذا سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ ہمارے آئندہ دستور میں یہ بنیادی شق شامل کی جائے کہ افرادِ مملکت (اور ان کی اولاد) کے رزق کی ذمہ داری، مملکت کے سر ہوگی۔ اور اس کے بعد عملاً ایسی تدابیر رفتہ رفتہ اختیار کی جائیں جن سے مملکت اپنی اس اہم اور بنیادی ذمہ داری سے سُبکدوش ہو سکے۔ یہی وہ بند ہے جس سے کمیونزم کا سیلاب رُک سکتا ہے ـــ نہ صرف کمیونزم کا سیلاب رُک سکتا ہے بلکہ یہ پاکستان کو اقوامِ عالم کی امامت (لیڈرشپ) کا مستحق بھی بنا سکتا ہے۔

(ایضاً ـــــ صـ۷)

غربت و افلاس کی ویرانیاں

مرکزی حکومت کی طرف سے ایک کمیٹی راولپنڈی کے جھوری دارالسلطنت کے باشندوں کا جائزہ لینے کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ اس کمیٹی کی جو رپورٹ منظرِ عام پر آئی وہ اہلِ شہر کی بے چارگی کی عبرت ناک کیفیت پیش کر رہی تھی۔ طلوعِ اسلام کے نزدیک یہ مسئلہ بڑا اہم اور بنیادی تھا چنانچہ مارچ سنہ ۱۹۶۰ء کے صفحات میں اس نے صورتِ حال پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے لکھا۔

اگر دوسرے شہروں کا بھی اسی طرح جائزہ لیا جائے تو آپ وہاں کے حالات اس سے بدتر نہیں تو بہتر بھی نہیں پائیں گے اور اگر شہروں سے ہٹ کر دیہات کی طرف چلے جائیں تو وہاں کی حالت جس قدر ناگفتہ بہ سامنے آئے گی، شہروں کے رہنے والے اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ... اگر ان لوگوں کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کے حالات کا بھی جائزہ لیا جاتا تو ایسا کرب انگیز نقشہ سامنے آتا جس سے ہر قلب حساس خون ہو کر آنکھوں کے راستے بہہ جاتا۔ ہمیں نظر آتا ہے کہ ہمارے ہاں کتنی فیصد آبادی ہے جسے دو وقت پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ کتنے لوگ ہیں جنہیں تن ڈھانکنے کو کپڑا میسر نہیں۔ کتنے مریض ہیں جو دوا دارو نہ ملنے کی وجہ سے قبروں میں جا پہنچتے۔ کتنے خاندان ہیں جن کے پاس مردے کی تجہیز و تکفین تک کا سامان نہیں ہوتا۔ کتنے بچے ہیں جو مناسب غذا (دودھ وغیرہ) نہ ملنے کی وجہ سے کمزور رہ جاتے یا مر جاتے ہیں۔ کتنے ہیں جو، ذرا بڑے ہو کر مدرسے نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم سے محروم اور آوارہ ہو جاتے ہیں۔ کتنے گھرانے ہیں جن میں جوان لڑکیاں مناسب بَر نہ ملنے کی وجہ سے بوڑھی ہو جاتی ہیں کتنے خاندان ایسے ہیں جن کے پاس اتنا بھی نہیں ہوتا کہ وہ دو جوڑے کپڑے دے کر بیٹی کو گھر سے اٹھا سکیں۔ کتنی شادی شدہ لڑکیاں ہیں جو مساعد حالات، مناسب خوراک، یا انسانوں جیسا سلوک نہ ملنے کی وجہ سے تپ دق کا شکار ہو جاتی ہیں۔ کتنی بیوائیں ہیں جن کے پاس سامانِ زیست تو ایک طرف ستر ڈھانکنے کے لئے کپڑے تک نہیں۔ کتنے یتیم ہیں جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ کتنے لاوارث بوڑھے ہیں جن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ زندگی کے باقی سانس پورے کس طرح کئے جائیں۔ اگر یہ کوائف معلوم کرنے کے لئے پورے ملک کا نہیں، کسی ایک شہر یا گاؤں کا جائزہ لیا جائے تو ایسے دردانگیز مناظر سامنے آئیں جنہیں شاید ہی کوئی چشم بینا برداشت　(لمعات طلوع اسلام بابت مارچ ۱۹۷۰ء)

نو دولتی خاندان کا سلسلۂ زرگری

ملک میں پھیلے ہوئے غربت و افلاس کی یہ تصویر پیش کرنے کے بعد طلوع اسلام نے تصویر کا ایک دوسرا رُخ بھی پیش کیا۔ یہ بڑھتی ہوئی فاقہ مستیوں کے مقابلے میں ملک کے نو دولتی خاندانوں کی عیش سامانیوں اور لوٹ کھسوٹ کے پھیلنے پھولنے جس کی تفصیل طلوع اسلام نے یوں پیش کی۔

دوسری طرف یہ جائزہ لینا بھی ضروری ہوگا کہ ملک میں کتنے خاندان ایسے ہیں جن میں سے ایک ایک کے پاس بیسیوں مکانات نہیں بلکہ محلات ہیں جن میں محلے کا محلہ آباد ہو سکتا ہے۔ کتنے امرا ایسے ہیں کہ جن کے کتوں پر جو کچھ صرف ہوتا ہے اس سے کتنے غریب گھرانے پل سکتے ہیں۔ کتنے دولت مند ایسے ہیں کہ جن کے ہفتہ بھر کے تفریحی خرچ سے شہر بھر کے لاعلاج مریضوں کو دوا دارو مل سکتا ہے۔

کتنے نو دولتی خاندان "ایسے ہیں جنہیں معلوم ہی نہیں کہ ان کے پاس کس قدر دولت جمع ہے اور اس میں ہر روز کتنا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ (ایضاً ص...)

معاشی ناہمواریاں اور مذہب ایک طرف غربت و افلاس کی ویرانیوں اور دوسری طرف دولت و سرمایہ کی ریل پیل سے پیدا شدہ ناہمواریوں کا تفصیلی نقشہ پیش کرنے کے بعد طلوعِ اسلام نے اس معاشرتی زبوں حالی کے اسباب و علل پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور اس سلسلے میں یہ لکھا کہ

• ہمارے ہاں جو اسلام مروج ہے وہ اس دور کی پیداوار ہے جب ملوکیت، پیشوائیت اور سرمایہ داری کا دور دورہ تھا۔ لہٰذا جن عناصر کا مجموعہ دنیا کے دیگر مذاہب ہیں وہی اس کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ جب دیگر مذاہب کا یہ حشر ہوا تو ہمارا خود ساختہ اسلام اس رَو سے کیسے محفوظ رہ سکتا تھا۔ اس کے زوال کا باعث یہ نہیں کہ اس کا پیش کرنے والا ان پڑھ مُلّا ہے۔ اسے اگر پڑھا لکھا طبقہ پیش کرتا تو بھی یہ باقی نہ رہ سکتا۔ اس میں باقی رہنے کی صلاحیت ہی نہ تھی۔ اس کی تعمیر میں ہی خرابی کی صورت مضمر تھی۔ انسانوں کا بنایا ہوا کوئی نظریہ یا نظام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ و پائندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ تو صرف خدا کے عطا فرمودہ دین کی خصوصیت ہے کہ وہ ہر زمانے کا ساتھ دیتا اور انسانی فکر کی امامت کرتا آگے بڑھتا جاتا ہے ... ہمارے پاس قرآن کا عطا کردہ ایسا معاشی نظام ہے جو ایک طرف نظام سرمایہ داری کی خون آشامی کا ازالہ کرتا ہے اور دوسری طرف کمیونزم کی انسانیت سوز تباہیوں سے بچا لیتا ہے۔ لیکن اگر ہم نے اپنے آئین کو قرآنی پیکر میں ڈھالنے کے بجائے اسے مغربی اقوام کے نقوش پر چلایا یا اس آئین میں مفاہمتوں (COMPROMISES) سے کام لینا چاہا تو مغربی اقوام تو شاید (اپنی سائنٹفک ترقیوں کے بل بوتے پر) کچھ دن اور جی لیں، لیکن ہماری تباہی کسی کے روکے نہیں رک سکے گی۔ (ایضاً۔ ص...)

پرویز صاحب کی مطبوعات

دینِ خداوندی کے منشار و مقصود کی ترجمان اور قرآنی حقائق و معارف کی نقیب ہیں۔ ان کے مطالعہ سے حقیقی اسلام کی روشنی حاصل کیجئے۔